طاہر جاوید مُغل
PDFBOOKSFREE.PK
شکست کی فتح

قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح..... ٹوٹے ہوئے

دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حسینہ کی پُر فکر داستان

شکست کی فتح

ساحر جاوید مغل

وہ دسمبر کے چوتھے ہفتے کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ بے حد تاریک، بے حد سرد اور بارش میں بھیگی ہوئی۔ کبھی کبھی بجلی زور سے چمکتی تھی اور کچھ ہی دیر بعد بادل دھاڑنے لگتے تھے لیکن بادلوں کی دھاڑوں کے علاوہ بھی کچھ دھاڑیں تھیں جو در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ نور، جس کا پورا نام عین النور تھا۔ ان دھاڑوں کو سنتی تھی تو سرتاپا لرز جاتی تھی۔ یہ انسانوں کی دھاڑیں تھیں، وحشی انسانوں کی دھاڑیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقص کررہے تھے اور انہوں نے اس قدیم حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار حویلی کے مضبوط چوبی پھاٹک پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ کی کوشش تھی کہ وہ دیواروں پر بانس کی لمبی سیڑھیاں لگا کر اندر گھس جائیں اور کچھ ایک دوسرے کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر بیرونی دیوار کے بالائی کنارے تک اپنے ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حویلی میں موجود لوگ اندر سے ان پر خشت باری کرتے تھے، یا پھر طویل لاٹھیوں کے ذریعے انہیں بیرونی دیوار پر سے دھکیل کر نیچے گرا دیتے تھے۔

حویلی میں موجود تمام عورتیں ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اس کمرے سے باہر مسلح پہرے دار موجود تھے تاہم ان کے چہرے بھی حالات کی سنگینی کے سبب تاریک دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ ان میں چھ سات نوجوان لڑکیاں تھیں، باقی درمیانی عمر کی یا بڑی عمر کی خواتین تھیں۔ تیئیس سالہ نور بے دم سی ہو گئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ایک قیامت ان کے سر پر ہے اور کسی بھی وقت ان پر ٹوٹ سکتی ہے۔

باہر سے کسی شرابی شخص کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔

"اوئے مولوی مہرا! ہم منڈے کو سہرا باندھ کر لائے ہیں۔ تیری دھی کو ہمارے ساتھ جانا ہی جانا ہے۔ زندہ یا پھر مردہ۔ اب بھی وقت ہے سوچ لے...... تیرے حق میں چنگا یہی ہے کہ اس کو تیار کر دے۔"

نور نے دیکھا، اس کے والد مولوی اشفاق مہرا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ، جیسے کمرے کی پرانی دیوار پر لرز رہا تھا۔ اسی اثنا میں ان کا بوڑھا ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ تھا جس میں سرخ رنگ کا کوئی کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ بوڑھے ملازم خدا بخش نے نور کے والد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔" خدا بخش کی آواز لرز رہی تھی۔

نور کے والد نے لفافہ لے کر سرخ جوڑے کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ مخمل پر چمکیلا کام تھا اور یہ واضح طور پر دلہن کا لباس نظر آتا تھا۔ اشفاق مہرا نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا اور بے دم سے ہو کر قالین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی نور ہی کی طرح دیوار سے ٹیک لگالی۔ پاس ہی نور کی بڑی بہن بسمہ بھی بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے باپ کے بازو کو یوں تھام رکھا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا کنارے کو تھامتا ہے۔

اسی دوران میں نور کی والدہ زلفت بیگم اندر داخل ہوئیں۔ وہ نور اور بسمہ کی سگی والدہ تو نہیں تھیں مگر آفت کی اس بھیانک گھڑی میں ان کا چہرہ بھی درد کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فرش پر گرا ہوا سرخ جوڑا اٹھا لیا اور پھر بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آ بیٹھیں۔ انہوں نے بڑی نرمی سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بوڑھے ملازم خدا بخش کی طرف دیکھا۔ وہ مالکن کا اشارہ سمجھ کر باہر نکل گیا۔ زلفت بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "مہرا صاحب! یہاں کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہو گی۔"

"تو کس طرح کروں میں اپنی مدد آپ؟" مولوی اشفاق مہرا نے زخمی آواز میں کہا۔ "اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے...... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں؟ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے...... اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لو۔"

"نہیں مہرا صاحب! لیکن...... جو کچھ بھی ہو رہا ہے...... اور جو کچھ ہونے والا ہے...... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی......"

"اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟" اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"مہرا صاحب! کچھ بھی ہے...... وہ لوگ...... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اگر ان سے صلح کی بات ہو جاتی ہے تو پھر وہ پورے طریقے سے اور عزت کے ساتھ اپنی بسمہ کو لے کر جائیں گے...... ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں بلکہ ابھی ان سے ہر طرح کی لکھت پڑھت بھی ہو سکتی ہے لیکن......"

زلفت بیگم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔

بادل ایک بار پھر زور سے گرجا اور اس کی آواز، باہر سے بلند ہونے والے للکاروں اور دھاڑوں میں گڈمڈ ہونے لگی۔
زلفت بیگم نے ہمت جمع کر کے اپنی بات مکمل کی...... "لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ...... یہ لوگ اندر گھس آئے اور...... دو چار اموات ہو گئیں...... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"
بسمہ نے سہمی ہرنی کی طرح نور کی طرف دیکھا اور اس کی گرفت اپنے باپ کے بازو پر کچھ اور سخت ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن زرد دکھائی دینے لگے تھے اور ایسی ہی زردی اس کے ریشمی رخساروں پر بھی کھنڈی تھی۔ وہ خوش شکل تھی۔ اس کے جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ کنگھی کیے ہوئے لمبے بال چوٹی کی صورت میں کمر کی طرف گئے ہوئے تھے مگر ابتلا کے ان لمحوں میں وہ بالکل بے ترتیب اور ہراساں تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح محفوظ پناہ گاہ میں گھس جانا چاہتی تھی جس پر نکیلے پنجوں والا عقاب جھپٹ رہا ہو۔
مولوی اشفاق مہرا کی خاموشی دیکھ کر زلفت بیگم کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے بوڑھے ملازم خدا بخش کو آواز دی۔ وہ مؤدب انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ زلفت بیگم نے کہا۔ "خدا بخش! تم برآمدے والی بیٹھک خالی کرواؤ...... اور بھائی جی سے کہو کہ ان لوگوں سے گل بات کرنے کے لیے، ان میں سے تین چار بندوں کو اندر بلا لیں۔ پر کسی کے پاس کوئی ہتھیار شتھیار نہیں ہونا چاہیے۔"
اس موقع پر اشفاق مہرا نے کچھ کہنا چاہا مگر بس، ان کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے تین چار گھنٹے کی جان لیوا کشمکش نے انہیں اندر سے بالکل توڑ ڈالا ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔
یہی وقت تھا جب انگریزوں کے زمانے کی اس دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زبردست دھما کا سنائی دیا۔ یوں لگا کہ نانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی کوئی بڑی دیوار مسمار ہو کر گری ہے۔ اس دھماکے نے کمرے میں موجود خواتین کو چلانے پر مجبور کر دیا۔ بسمہ بھی دہشت زدہ ہو کر باپ سے چمٹ گئی۔ مولوی مہرا خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ ملازم خدا بخش ان کے ساتھ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواروں کے قریب شور و غل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ لکڑی اور لوہے کے مضبوط پھاٹک کو توڑنے کی کوششیں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ چھت پر سے کی جانے والی خشت باری میں بھی تیزی آ گئی تھی۔
سہمی ہوئی خواتین رو رہی تھیں اور ان میں سے کئی ایک کے ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلتے چلے جا رہے تھے۔ زلفت بیگم نے بسمہ کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کا منہ سر چومنے لگیں۔ وہ بے چاری سر تا پا کانپ رہی تھی۔ نور کی خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے اسے بانہوں میں لے کر لکڑی کی ایک چوکی پر بٹھایا۔ خالہ عریفہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ "نہ میری دھی، اتھرو پونچھ لے...... بیٹیاں ہمیشہ اپنے ماں پیو کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔ دیکھنا رب سوہنا تیری مدد کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اج کے دیری کل تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے...... ساری مصیبتیں دفع دور ہو جائیں گی۔"
زلفت بیگم نے ایک ملازمہ لڑکی کو خفیف اشارہ کیا۔ وہ دھیمے قدموں سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پیلا دوپٹا تھا اور مٹی کا ایک بڑا سا روغنی پیالہ تھا۔ پیالے میں گھلی ہوئی مہندی تھی۔ خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے دوپٹا بسمہ کے جھکے ہوئے سر پر ڈال دیا۔ وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔
نور نے اپنی بڑی بہن کی حالت دیکھی اور سر کا عقبی حصہ دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ شاذ و نادر ہی روتی تھی۔ رونا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا لیکن آج جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو گرم آنسوؤں کی دھاریں سی اس کے سرد رخساروں پر بہہ نکلیں۔ وہ جیسے اندر سے چکنا چور ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا، اس سے تھوڑی دور فرش پر تانبے کی ایک گول طشتری پڑی تھی۔ اس طشتری میں مٹی کے قریباً ایک درجن دیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی روشن نہیں تھا۔ کچھ دیے اوندھے اور کچھ سیدھے تھے۔ نور کی دادی ان کے قریب افسردہ بیٹھی تھی۔ اس تنہا حویلی سے باہر درختوں اور جھاڑیوں پر اور اونچے نیچے ٹیلوں پر اور بارشی نالے کے کناروں پر بجلی چمک رہی تھی اور بادل دھاڑ رہے تھے...... مگر حویلی کی بیرونی دیوار کے قریب سے بلند ہوتے والی دھاڑیں اب ماند پڑ گئی تھیں۔ خشت باری کی آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ...... حویلی کی چھوٹی بیٹھک میں بات چیت شروع ہو گئی ہے۔ نور سوچنے لگی۔
کیا یہ بات چیت کامیاب ہو سکے گی؟
کیا وہ قیامت ٹل جائے گی جو دسمبر کی اس طویل رات میں اس حویلی کی دیواروں کے باہر منڈلا رہی تھی؟

کیا مہر اخاندان کی عزتیں بچ جائیں گی؟
کیا اپنی عزت وآبرو کا دفاع کرتے ہوئے اس کے ابا، اس کے تایا، اس کے دونوں ماموؤں اور بہنوں بھائیوں کو اپنی جانیں نہیں گنوانا پڑیں گی؟
سوال تو بہت تھے لیکن جواب کوئی نہیں تھا۔
عین النور نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور خود کو ارد گرد کے ماحول سے کاٹنے کی کوشش کرنے لگی...... اور وہ اکثر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ سب سے الگ تھلگ ...... کم گو...... اپنی ہی سوچوں میں گم رہنے والی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے ......نور کو نیند تو نہیں آئی مگر ایک تھکن سی اس پر طاری ہونے لگی۔ اس تھکن نے اس کی شدید ترین تشویش اور گھبراہٹ کو کسی حد تک کم کر دیا تھا...... ویسے بھی وہ نسبتاً مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسے حالات سے لڑنا آتا تھا...... یہ اور بات ہے کہ ایسی لڑائیوں میں وہ بہت مرتبہ ہاری بھی تھی ...... وہ سوچنے لگی...... وہ اس ہولناک رات تک کیسے پہنچی ہے؟ کس طرح کے واقعات نے کس طرح کا رخ اختیار کیا کہ آج وہ اور اس کے خاندان والے اس قیامت کے دہانے پر ہیں۔ اس کا ذہن بڑی تیزی لیکن بڑی تفصیل سے واقعات کی پرتیں کھولنے لگا۔ وہ عارضی طور پر ہی سہی لیکن اپنے اردگرد کے وحشت ناک ماحول سے تھوڑے فاصلے پر چلی گئی۔ بارش، گرج، للکاریں، دھاڑیں، ڈری ہوئی سرگوشیاں، چلتے پھرتے بے تاب قدموں کی آوازیں ......سب کچھ ساعت میں دھندلا سا گیا۔ ماضیِ دور اور ماضیِ قریب کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگے۔

☆☆☆

عین النور نے گجرات سے آگے تحصیل پھالیہ کی طرف موراں والی نام کے گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ اب تو وہاں پکی سڑک پہنچ چکی تھی مگر نور کے بچپن میں وہاں صرف کچا راستہ تھا، پکی سڑک تک جانے کے لیے ان لوگوں کو تانگوں وغیرہ پر کوئی دس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ نور نے ایک بھرے پُرے آسودہ گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والد مولوی اشفاق اور تایا خلیل مہرا علاقے کے خوشحال زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ نور سے بڑی دو بہنیں بتول اور بسمہ تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ تینوں بہنوں کا بچپن اسی گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں اور سرسبز ٹیلوں پر کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ تایا خلیل بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی مہرین جو تقریباً نور ہی کی ہم عمر تھی۔ اس کے کزن شرجیل اور عثمان تھوڑے سے بڑھاکو تھے لیکن کھیل کود میں وہ بھی سب کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔
نور کے بچپن اور لڑکپن کی یادیں بڑی سہانی تھیں۔ ماموں اور تایا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر بھر کے بچوں میں سب سے چھوٹی وہی تھی۔ اسے خصوصی پروٹوکول ملتا تھا...... برسات کے موسم میں آموں کے باغوں میں جھولے، سردیوں کی سنہری دھوپوں میں وسیع لان کے اندر کھیل کود اور گیندے کے پودوں میں تتلیوں کا تعاقب...... گرمیوں میں چاندنی راتیں اور کشادہ چھت پر بچھی ہوئی بہت سی چارپائیاں...... کہانیاں، چٹکلے اور شریر سرگوشیاں...... اور بہار...... بہار کا موسم تو جیسے نور کے دل میں کھب جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں ایک وسیع پھلواری تھی جو ان کی اپنی ہی ملکیت تھی۔ اس پھلواری میں ایک جانب پھل دار درختوں کا باغ تھا۔ نور کی والدہ، دادی جان، پھوپیاں دو ممانیاں اور ان کے بچے اکٹھے ہوتے تو اس باغ میں بہار پر بہار آجاتی۔ ایک بہت بڑی دری بچھائی جاتی۔ اس پر ایک درخت کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر دادی جان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی۔ ایک جانب ڈھولک رکھ کر گانے گائے جاتے، وہیں پر کھلے میں پکوان بنائے جاتے اور کھیل کود ہوتا۔ ایسی محفلوں میں خاندان کا کوئی مرد شریک نہیں ہوتا تھا اور اونچی دیواروں والے باغ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔
گاؤں کی خوشگوار زندگی میں خوشی کی ایک تازہ لہر اس وقت آتی تھی جب سردیوں کے گلابی موسم میں بڑے پیر جی کا میلا آتا تھا۔ اسے عرفِ عام میں امنالے کا عرس کہا جاتا تھا۔ قرب وجوار میں اس میلے کی دھوم تھی۔ لوگ دو ماہ پہلے سے ہی اس موقع کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ چوڑیاں، پراندے اور جوتے وغیرہ خریدے جاتے تھے۔ چڑھاوے کی چادریں تیار ہوتی تھیں۔ بچوں کی تیاری کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ میلا پورا ہفتہ جاری رہتا تھا...... اور ہر بار اہلِ علاقہ کو بہت سی سنہری یادیں دے کر رخصت ہوتا تھا۔
بچپن میں نور بھی اس میلے کو بڑی روانی سے امنالے کا میلا کہا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ لفظ ''امنالا'' نہیں بلکہ امناں والا ہے۔ یعنی امن اور محبت والا۔ بڑے پیر صاحب کا مکمل نام پیر برکات امناں والا تھا۔ وہ زندگی بھر پیار اور محبت کا درس دیتے رہے تھے۔ کہا

جانا تھا کہ وہ جانی دشمنوں کو جاں نثار دوستوں میں بدل دیتے تھے۔ ان کی بابرکت ذات کی وجہ سے بہت سے خاندانوں اور برادریوں کے چھوٹے بڑے جھگڑے جڑ سے ختم ہو گئے تھے۔ انہی کی نسبت سے میلے کا نام امناں والے کا میلا پڑ گیا تھا۔

نور نے ساتویں کا امتحان "موراں والی" کے ہائی اسکول سے ہی پاس کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر قریباً تیرہ سال تھی...... منجھلی بہن بسیمہ کوئی پندرہ سال کی اور بڑی بہن بتول انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دو ڈھائی سال پہلے میٹرک کر چکی تھی۔ اسکول کے بعد اب وہ کالج جانا چاہتی تھی اور کالج جانے کے لیے اس کا گجرات جانا ضروری تھا۔ وہاں وہ اپنے کچھ ننھیالی عزیزوں کے پاس رہ سکتی تھی۔ نور کے والد مولوی اشفاق بالکل اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کافی ہو گئی ہے، بتول اب سلائی کڑھائی سیکھ لے......اور اگر زیادہ بات ہے تو پھر آرٹس کے مضامین لے کر پرائیویٹ ایف اے کر لے۔ بتول بڑوں کی ہر بات پر سر جھکانے والی لڑکی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے والدین چاہتے تھے۔ بڑی بہن بتول سے نور کو بڑا لگاؤ تھا۔ جب آپی بتول کے بارے میں نور کو پتا چلا کہ وہ کالج نہیں جائے گی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی کہ اب اسے آپی کی مزیدار کمپنی میسر رہے گی۔

ہاں، وہ بڑے اچھے دن تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر پھر ایکا ایکی نور کو محسوس ہونے لگا کہ گھر میں سب اچھا نہیں ہے۔ بڑے کچھ پریشان تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے صلاح مشورے کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی تھیں پھر ایک دن نور کو بسیمہ سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اپنے بڑے بیٹے ابدال احمد کے لیے آپی بتول کا رشتہ مانگ رہا ہے......اور یہ رشتہ آپی سمیت گھر میں کسی کو بھی قبول نہیں۔

یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کھاریں برادری کے چودھری طغرل کے دونوں بیٹے انتہا کے بگڑے تگڑے تھے۔ لڑائی جھگڑا، زمینوں پر قبضے، نشے بازی...... کون سی ایسی لت تھی جو ان میں موجود نہیں تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں چودھری طغرل بھی کچھ کم نہیں رہا تھا۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ وہ کچھ دھیما پڑ گیا تھا مگر فطرت تو وہی تھی۔

بڑی بہن بسیمہ نے سراسیمہ لہجے میں نور کو بتایا تھا۔ "وہ یہ کھاریں برادری والے بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے بہت آگے تک جاتے ہیں۔ پہلے تو پیار محبت اور پالیسی سے کام لیتے رہے ہیں، پر اب دھمکیوں پر اتر آئے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟" نور نے بھولپن سے پوچھا تھا۔

"کہتے ہیں کہ ہمارے اباجی زبان دے کر مکر رہے ہیں، حالانکہ اباجی نے کوئی زبان دی ہی نہیں تھی۔ وہ سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور طاقت کے زور پر اس کو سچ بنانا چاہتے ہیں۔"

نور نے کہا۔ "تو اباجی...... پولیس والوں کو کیوں نہیں بتاتے۔ وہ جو موچھوں والے لمبے سے انکل آیا کرتے ہیں، وہ اباجی کے دوست ہیں۔ اباجی نے کہا تھا کہ وہ تھانیدار ہیں۔"

"وہ چھوٹے تھانیدار ہیں نور۔ یہ جو چودھری طغرل ہے اس کے تعلقات تو بڑے بڑے تھانیداروں سے ہیں۔ ویسے بھی اس طرح کی باتیں پولیس وغیرہ تک نہیں پہنچائی جاتیں۔ بڑے بوڑھے خود ہی بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔"

"تو پھر کیوں نہیں کرتے فیصلہ؟ ہم اپنی پیاری آپی کی شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔ کسی اور کی مرضی سے نہیں۔"

وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسے پریشان کن باتوں سے دور رکھا جاتا تھا پھر بھی اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ابا اور تایا کے چہرے تتے رہتے تھے۔ دونوں ماموں جواں سال تھے۔ وہ کسی وقت بہت طیش میں نظر آتے تھے۔ ایک دن اس نے چھوٹے ماموں کو چھت پر بیٹھ کر بڑے غصے میں مسواک چباتے اور اپنی رائفل بھی صاف کرتے دیکھا تھا۔ گھر میں پنچایت وغیرہ کا ذکر بھی چل رہا تھا۔

پھر ایک دن سب کچھ ٹھیک ہوتا محسوس ہوا۔ نور کو پتا چلا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے اباجی کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور ان پر سے بلا ٹل گئی ہے۔

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آپی بتول کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اپنے خاندان میں ہی ایک دور کے رشتے داروں میں آپی کی بات ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ملتان میں رہتے تھے۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی لیکن نور ان دنوں کچھ اداس بھی رہا کرتی تھی۔ اس کی آپی بیاہ کر اس سے دور جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا اور اس کی آپی شادی کے بعد اپنے پیا کے شہر چلی گئی۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا...... اور یہ کچھ عرصے تک ٹھیک بھی رہا مگر پھر آہستہ آہستہ گھر کے ماحول میں دوبارہ بے چینی پائی جانے لگی۔ معاملہ وہی کھاریں برادری والوں کا تھا۔ انہوں نے بات اپنے دل سے نکالی

نہیں تھی۔ ایک روز ماں نے اسے بتایا۔ ''تمہارے ابا باغ والی اپنی زمین بیچ رہے ہیں۔''

''پر کیوں امی؟ وہاں تو ہم جھولے ڈالتے ہیں، اتنا مزہ کرتے ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔

''وہ زمین کھاپڑا والوں کی زمین کے ساتھ لگتی ہے اور وہاں آئے روز جھگڑا ہوتا ہے۔''

''جھگڑا ہو تو زمین بیچ دی جاتی ہے؟ اور جھگڑا ہوتا کیوں ہے امی؟''

''جنہوں نے جھگڑنا ہوتا ہے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور تمہارے ابا اور تایا خواہ مخواہ کی دشمنی سے بچنا چاہتے ہیں۔''

''تو دشمنی سے بچنے کے لیے ہم اپنی زمین کیوں بیچیں۔ وہ لوگ بیچ دیں نا۔''

''جس کا زیادہ زور چلتا ہے اس کی بات بھی چلتی ہے۔'' ماں نے آہ بھر کر کہا تھا۔

وہ زمین بک گئی جہاں نور کے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ نہ صرف زمین بک گئی بلکہ چند ماہ کے اندر اندر حالات اتنے خراب ہوئے کہ ابا اور تایا نے اپنی باقی زمین بھی فروخت کر دی...... اور آبائی گاؤں موراں والی کو اور گجرات کو چھوڑ کر خاموشی سے لاہور آ گئے۔ نور ان دنوں آٹھویں کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔

لاہور کی ایک نئی رہائشی کالونی میں ان لوگوں نے دس دس مرلے کے دو بنے بنائے گھر خریدے تھے۔ دونوں گھروں میں مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ایک گھر تایا کے لیے اور دوسرا ان کے لیے تھا۔ نور کو یہاں ایک اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ تایا کے بچوں کو بھی مناسب جگہوں پر داخلے مل گئے۔ بسمہ اب میٹرک پاس کر چکی تھی اور یہاں مسئلہ پھر وہی کالج میں داخلے کا تھا۔ نور کے اباجی تذبذب میں تھے۔ بہر حال تایا جان کی کوشش سے یہ مسئلہ حل ہوا اور اباجی ایک قریبی کالج میں بسمہ کا داخلہ کرانے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں تو نور کے والد کی طرح اس کے تایا بھی مذہبی ذہن رکھتے تھے اور انہی کی طرح باریش بھی تھے مگر مولوی جی کا سابقہ صرف نور کے اباجی کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں بہت سلوک اور یگانگت کے باوجود تھوڑا سا فرق بھی موجود تھا۔ تایا جان کے گھر میں ٹی وی، ٹیلی فون وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے جینز شرٹ اور دیگر جدید لباس پہنتے تھے اور گھر میں کچھ آزادی دکھائی دیتی تھی مگر نور کے گھر میں چونکہ صرف بیٹیوں نے ہی پرورش پائی تھی، اس لیے یہاں ماحول قدرے سخت تھا۔ پردے اور نماز روزے کی پابندی تایا جان کے گھر سے تھوڑی زیادہ تھی۔ موبائل فون تو ان دنوں موجود ہی نہیں تھا...... مگر عام فون بھی ان کے گھر میں کبھی نہیں لگوایا گیا۔ یوں تو تائی جان بھی پردہ کرتی تھیں لیکن نور کی امی باقاعدہ برقع پہنتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے گھر میں اکثر ایک طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ اباجی مخلوط تقریبات میں شرکت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شادی کے موقع پر اضافی رسموں سے بھی انہیں اختلاف تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے شہر میں آ جانے کے بعد نور کے لیے چند ماہ تک تو روز و شب بڑے اجنبی سے رہے۔ یہاں کی تیز رفتار زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں سب کو دشواری پیش آئی لیکن پھر جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اسکول میں نور کی ایک دو سہیلیاں بھی بن گئیں۔ وہ پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ انہی دنوں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ نور نے سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لیا اور پہلے نمبر پر آ گئی۔ اسے ایک چھوٹا سا کپ بھی ملا۔ وہ اسکول سے گھر واپس آئی تو امی جان، تائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بسمہ کالج سے واپس آ چکی تھی۔ اس نے نور کا پھولا ہوا بستہ دیکھا تو پوچھا۔ ''اوئے، یہ کیا گھسایا ہوا ہے اس میں؟''

''تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟'' نور نے الٹا اس سے سوال کیا۔

بسمہ نے بستے کے اندر ہی کپ کو ٹٹول کر دیکھا اور بولی۔ ''کوئی سخت سی چیز لگ رہی ہے۔''

''سخت سی چیز ہے اور سخت محنت کر کے جیتی ہے بھئی۔'' نور نے کہا اور بستے سے کپ نکال کر بسمہ کو دکھایا۔

بسمہ خوش ہوئی۔ ''کس چکر میں ملا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری بہن دوڑ میں پہلے نمبر پر آئی ہے...... سو میٹر کی دوڑ۔''

بسمہ تھوڑا سا چونکی پھر ادھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''اوئے تیرا بیڑا اترے۔ تُو نے دوڑ میں حصہ لیا ہے؟''

''بتا تو رہی ہوں۔''

بسمہ نے کہا۔ ''اباجی کو پتا چل گیا نا... تو ٹھیک ٹھاک جھاڑیں پڑیں گی۔ ان کو یہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔

''مگر بسمہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے کوئی تیراکی... میں تو حصہ نہیں لیا۔ دوڑ میں ہی لیا ہے نا...... اور وہ بھی حجاب پہن کر۔''

"مگر تو دوڑی تو ہے نا پھر تیلی بیگم۔ دڑنگے تو مارے ہیں نا تُو نے؟"

"میری کسی بات پر یہاں تو کوئی خوش ہی نہیں ہوتا۔" نور نے منہ بنایا۔ "آپی یا تمہاری ہر بات کی تعریف ہوتی ہے۔ مجھے تو جیسے ایک کونے میں ڈالا ہوا ہے۔ اباجی تو رحم کی نظر ہی نہیں ڈالتے۔ لگتا ہے ان کی سگی بیٹی ہی نہیں ہوں۔"

"خبیث کہیں کی۔" بسمہ نے اس کا کان مروڑا۔ "بہت محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے۔ بس یہ جو تیری دکھری رگ ہے نا اس کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کبھی کبھی۔"

"کیا دکھری رگ ہے میری؟"

"یہ جو ہر وقت رسالے پڑھتی ہے..... کسی کونے میں گھسی رہتی ہے..... اور نمازیں بھی قضا کر دیتی ہے۔"

"کب نمازیں قضا کرتی ہوں میں؟" نور نے لڑاکی مرغی کی طرح پر پھیلائے۔ "کب کونے میں گھسی رہتی ہوں ...... اور رسالے کو تو ہاتھ لگائے، آج مجھے پورا ایک مہینا ہو گیا ہے۔"

"توبہ توبہ ..... پورا ایک مہینا۔ ابھی پرسوں اتوار کو چھت پر بیٹھی کیا پڑھ رہی تھیں؟"

"وہ رسالہ نہیں تھا، اسکول کا میگزین تھا۔ اسپورٹس کے صفحے دیکھ رہی تھی۔" نور تنک کر بولی۔

شاید یہ بحث مزید آگے چلتی مگر اسی دوران میں بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بسمہ نے نور کا چھوٹا سا کپ جلدی سے اس کے اسکول بیگ میں گھسا دیا اور بیگ کو بیڈ کے نیچے کر دیا۔ اندر آنے والے اباجی ہی تھے۔ وہ آج کل لاہور کے مضافات میں کچھ زمین خرید کر وہاں چھوٹے چھوٹے رہائشی پورشن وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے...... اور اس سلسلے میں بڑے ماموں مراد کے ساتھ مل کر کافی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو بازار میں ایک دکان بھی خریدی تھی جہاں وہ اسلامی کتب کی ہول سیل کا ارادہ رکھتے تھے۔

اپنی کامیابی اور کپ کے حصول کی خوشی نور کو کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اگلے روز اس نے والدہ کو بھی اپنا جیتا ہوا کپ دکھایا۔ والدہ خوش ہوئیں لیکن انہوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو اس سے پہلے بسمہ کہہ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "نور! بس اپنی پڑھائی کی طرف توجہ رکھو۔ اب تم نے میٹرک کا امتحان دینا ہے اور یہ کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں پاس کر لوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولی اور الھڑ انداز میں چارپائی پھلانگتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

اس سے اگلے روز جب وہ اسکول پہنچی تو اسکول میں اسپورٹس کی ٹیچر مسز نبیلہ وجدان نے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فزیکل ٹریننگ میں باقاعدگی سے حصہ لے اور خاص طور سے رننگ میں۔ اس کی رننگ اچھی ہے اور وہ محنت کرے تو مقابلے جیت سکتی ہے۔

نور نے کہا۔ "ٹیچر! شاید میرے گھر والے ہی مجھے اس کی اجازت نہ دیں۔"

"ہائیں۔" مسز وجدان نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ تم ایک صحت مند سرگرمی میں حصہ لے رہی ہو اور وہ بھی چاردیواری کے اندر۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "ٹیچر! دراصل ...... میرے ابا جان ...... اس معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ شاید وہ منع کر دیں۔"

"کبھی بھی نہیں کریں گے۔ تم کسی دن مجھے ان سے ملواؤ۔ میں خود بات کروں گی۔" مسز وجدان نے پورے یقین سے کہا۔

نور نے یہ بات بڑی بہن بسمہ کو بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں اسے اباجی سے اجازت لے کر دے۔ نور کی نسبت بسمہ اور بتول کی بات اشفاق صاحب ذرا نرمی سے سن لیتے مگر یہ موضوع ایسا تھا کہ بسمہ کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دو تین دن کوشش کرتی رہی کہ اس حوالے سے تھوڑا بہت ابا جان کو بتا دے...... تاکہ اگر انہیں بعد میں پتا چلے تو وہ بہت زیادہ ناراض نہ ہو جائیں مگر نور اور بسمہ میں سے کوئی بھی یہ بات اباجی کے سامنے زبان پر نہ لا سکیں۔ رہیں والدہ تو ان کی والد صاحب کے سامنے سٹی ہی گم ہو جاتی تھی۔ اشفاق صاحب آج کل ویسے بھی ذرا ناخوشگوار موڈ میں تھے۔ تعمیری کام کے سلسلے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ آتے اور ان کی پیشانی کا بل دیکھ کر ہی نور سمجھ جاتی کہ بسمہ آج بھی کوئی بات نہیں کر سکے گی۔

تین چار روز بعد دونوں بہنوں نے یہ کوشش ویسے ہی ترک کر دی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ ایک دن اسپورٹس ٹیچر مسز وجدان نے پھر نور کو اسٹاف روم میں بلایا۔ انہوں نے کہا۔ "نور! تم نے اپنے والد صاحب سے بات نہیں کرائی؟"

وہ جواب پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ "ٹیچر! آج کل وہ کنسٹرکشن کرا رہے ہیں۔ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ اب بھی

لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، جب بھی موقع ملے مجھے ان سے ضرور ملواؤ...... اور دیکھو اگلے مہینے ایک اچھا ایونٹ ہے۔ ہمارے اسکول کی لاہور کی تمام برانچز کے مشترکہ کھیل ہو رہے ہیں۔ تم ان میں حصہ لو۔ تھوڑی محنت کرو تو پہلی، دوسری پوزیشن حاصل کر سکتی ہو۔‘‘

’’مجھے کرنا کیا ہو گا ٹیچر؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں۔ فزیکل ٹریننگ کا پریڈ تو ہوتا ہی ہے، اس میں باقاعدگی سے حصہ لو۔ پھر ہفتے میں دو روز ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رننگ کی ٹریننگ ہوتی ہے، جو گر تو ہوں گے تمہارے پاس؟‘‘

’’نہیں ٹیچر! لیکن میں لے لوں گی۔‘‘ وہ بولی۔

’’شاباش۔ تم ضرور آگے بڑھو گی۔ ایک اچھی ’’اسپرنٹر‘‘ بنو گی۔‘‘ انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

نور خاموشی سے ٹریننگ میں حصہ لیتی رہی۔ مسز وجدان اس پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ پریکٹیکل کے ساتھ ساتھ وہ اسے تھیوری بھی سمجھا رہی تھیں۔ ’’دیکھو نور! چھوٹے فاصلوں کی دوڑوں میں اسٹارٹنگ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایتھلیٹ اسٹارٹ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر کرتا ہے تو یہ دسواں حصہ آگے جا کر ایک یا دو سیکنڈ میں بدل جاتا ہے......‘‘

ایک دن انہوں نے کہا۔ ’’نور! دوسری لڑکیوں کی نسبت تمہارے reflexes بہت اچھے ہیں...... کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم نیچرل ونر ہو۔ کیا تمہاری فیملی میں پہلے بھی کوئی ایتھلیٹ رہا ہے؟‘‘

’’نہیں ٹیچر۔‘‘ نور نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’لیکن اگر آپ بھاگ دوڑ کو ایتھلیٹکس کہیں تو پھر بھاگ دوڑ تو ہم نے خوب کی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم پہلے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر کے ساتھ بہت بڑا باغ تھا۔ ہم بہن بھائی سارا سارا دن اس میں دوڑیں لگاتے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کزنز نے میرا نام اڑن چھو ڈال رکھا تھا۔‘‘

’’تم واقعی اڑن چھو بن سکتی ہو نور۔ بس تھوڑی سی محنت اور مستقل مزاجی چاہیے۔‘‘

اسکول کی ’’برانچز‘‘ کے مقابلے ہوئے۔ ان میں سو میٹر کی ریس بھی تھی۔ نور نے یہ فائنل مقابلہ بہ آسانی جیت لیا۔ وہ دوسرے نمبر پر آنے والی کھلاڑی سے کم از کم دو سیکنڈ آگے رہی تھی۔ ٹیچرز کے علاوہ ڈائریکٹر صاحب نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ اسے ٹرافی ملی اور تعریفی سرٹیفکیٹ بھی۔

اس مرتبہ اس کی یہ کامیابی چھپی نہیں رہ سکی۔ تایا کے گھر میں بھی سب کو پتا چل گیا تھا لہٰذا بسمہ نے ضروری سمجھا کہ ابا جان کو بھی یہ بات خود بتا دی جائے۔ اس روز ان کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا نماز مغرب کے بعد بسمہ نے اوڑھنی سختی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹی اور ابا جان کے پاس چلی گئی۔ اس نے ٹرافی ابا جان کو دکھائی۔ ’’یہ کس کی ہے؟‘‘ وہ حیران ہو کر بولے۔

’’نور کی...... اسکول سے ملی ہے۔‘‘

’’مگر اس کے نمبر تو اتنے اچھے نہیں تھے؟‘‘

’’اباجی! اس نے دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ یہ دیکھیں یہ سرٹیفکیٹ بھی ہے۔‘‘ مولوی اشفاق مہر کی پیشانی پر بے ساختہ ایک بل نمودار ہو گیا۔ سرٹیفکیٹ اور ٹرافی دیکھنے کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں آہستہ سے ایک طرف رکھ دیں اور بولے ’’وہ خود کہاں ہے؟‘‘

’’ڈ...... ڈر رہی تھی کہ آپ کو برا نہ لگے۔‘‘

’’ڈر تو اللہ کا ہونا چاہیے۔ ہم نے یہاں کون سا بیٹھے رہنا ہے تم لوگوں پر پابندیاں لگانے کے لیے۔‘‘ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر آواز دی۔ ’’عین النور! کہاں ہو عین النور!‘‘ وہ اسے ہمیشہ پورے نام سے پکارتے تھے۔

نور ڈری ڈری سی باپ کے بستر پر پائینتی کی طرف آ بیٹھی۔ وہ نسبتاً دھیمے لہجے میں بولے۔ ’’دیکھو بیٹی، ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کی رائے اور مشورے میں بھلائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کھیل کود، اچھل پھاند لڑکوں کے کام ہیں۔ لڑکیاں پڑھائی اور گھر گرہستی کے کاموں میں ہی اچھی لگتی ہیں......‘‘

’’بس اباجی! ٹیچر نے ہی زور دیا تھا کہ تھوڑا بہت......‘‘ آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔

’’کیا تھوڑا بہت؟‘‘ وہ عینک درست کر کے بولے۔

’’یہی کہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ بھی تھوڑا بہت...... ہونا چاہیے۔‘‘

’’تو بھئی، نصابی سرگرمیوں کے علاوہ تم اور بھی تو کچھ کر سکتی ہو۔ تمہاری آواز اچھی ہے۔ قرأت اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لے سکتی ہو۔ پھر تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ سلائی کڑھائی کے کمپٹیشن ہوتے ہیں......‘‘

’’ٹھیک ہے...... ابا جان...... میں کوشش کروں گی۔‘‘ اس نے کہا۔

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ "دیکھو عین النور! ہم ایک دیندار گھرانے سے ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں، کچھ اصول ضابطے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے دوسرے بچوں کی بہ نسبت تم ان اصول و ضابطوں سے کچھ دور ہو۔ یہ چیز مجھے کبھی کبھی رنج بھی دیتی ہے...... اپنے ان معاملات پر غور کرو اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں، والدین کبھی بھی اپنے بچوں کا برا نہیں سوچتے۔"

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی اوڑھنی سر سے سرکنے نہ پائے۔ کل اس نے اپنے بالوں کی کچھ کمزور لٹیں کاٹی تھیں۔ یہ کٹنگ اس موقع پر اباجی کے سامنے آجاتی تو ان کی خفگی ایک دم غصے میں بدل سکتی تھی۔

نور پڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی۔ تاہم وہ ان طالب علموں میں سے تھی جو تھوڑی کوشش کے ساتھ امتحان بہ آسانی پاس کر لیتے ہیں۔ پڑھائی جاری رہی اور اس کے ساتھ تھوڑا تھوڑا شوق بھی ہوتا رہا۔ اسے اب خود بھی رننگ میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسپورٹس ٹیچر کی ہدایت کے مطابق اسے اسکول میں آدھی چھٹی کے بعد ایک پریڈ کی اضافی چھٹی مل جاتی تھی۔ وہ اور اس کی کلاس فیلو شاہینہ اس دوران میں رننگ کرتی تھیں۔ اسکول کا گراؤنڈ خاصا وسیع تھا۔ ایک چکر تقریباً نصف کلومیٹر کا بن جاتا تھا۔ وہ دونوں روزانہ قریباً چار چکر لگاتیں۔ اس کے بعد گھنے درختوں کے نیچے ایک پاتھ پر "اسپرنٹس" یعنی سو میٹر کی تیز رفتار دوڑیں لگائی جاتیں۔ اکثر اوقات مسز وجدان بھی موقع پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کو سو میٹر کے اسرار و رموز سمجھاتیں۔ اسٹاپ واچ ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی...... اور نگاہیں فنش لائن پر۔ وہ اس بات پر خوش تھیں کہ دونوں لڑکیوں کا ٹائم روز بروز بہتر ہو رہا تھا۔ خاص طور سے نور کا۔

ٹرافی والے واقعے کے بعد اباجان اور نور میں دوڑ وغیرہ کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح تعمیراتی کام میں الجھے ہوئے تھے۔ اباجان کو نور سے جو دو چار شکایتیں تھیں، وہ اس نے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ صبح جلدی اٹھتی تھی۔ نماز میں بے قاعدگی ختم کر دی تھی۔ کزنز کی موجودگی میں دوپٹا اپنے سر سے سرکنے نہیں دیتی تھی، اس کے علاوہ پڑھائی پر بھی توجہ دے رہی تھی۔

ایک دن نور اسکول سے گھر آئی تو بسمہ کو روتے ہوئے پایا۔ وہ بھی ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی اور اپنے سفید براق یونیفارم میں پیاری لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا بسمہ؟" نور نے بڑی بہن کو بے تکلفی سے بانہوں میں لیتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ پہلے تو ٹالتی رہی پھر اس نے بتایا کہ آج گاؤں سے دو بندے آئے تھے۔ وہ اباجی اور تایا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک دو باتیں بسمہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھیں۔

"کیا کہا انہوں نے؟" نور نے پوچھا۔

بسمہ ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالتے ہوئے بولی۔ "نور! ہم حیران ہوتے تھے نا کہ آپی بتول والا معاملہ تو ختم ہو گیا...... پھر تایا اور اباجان گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر میں کیوں آگئے۔"

"ہاں، یہ حیرانی تو تھی۔"

"اس کی وجہ امی اور دادی کو بھی معلوم تھی۔ پر انہوں نے کبھی ہم سے ذکر نہیں کیا۔"

"کیا وجہ تھی؟"

"وہ لوگ ابھی تک اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹے نور...... خاص طور سے چودھری کا بیٹا ابدال۔ وہ ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم ہے، چودھری اب کہتے ہیں کہ اگر بڑی کا رشتہ نہیں ہو سکا تو چھوٹی کا ...... یعنی میرا رشتہ انہیں دیا جائے۔ اب پنچایت والے بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ ایک ہی بات کہتے ہیں کہ ہمارے گھر والے زبان دے کر انکاری ہوئے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک لڑکی کا رشتہ تو دینا ہوگا۔"

"اوہ گاڈ۔" نور نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ "یہ ضد اور ہٹ دھرمی بھی کیا بلا ہوتی ہے ان چودھریوں وڈیروں میں...... خدا کے بندو! شادی تو زندگی بھر کا ساتھ ہے اور اس میں لڑکے لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی کو گائے بکری کی طرح کان سے پکڑا اور کسی کھونٹے سے باندھ دیا۔" نور کے لہجے میں تپش تھی۔

"یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔" بسمہ بولی۔

"اب کیا ہوگا؟"

"اباجان اور تایا جان کل گجرات جا رہے ہیں۔ کسی ایم پی اے سے بات کرنی ہے انہوں نے تاکہ یہ جھگڑا زیادہ نہ بڑھے۔"

امی بڑے کمزور دل کی تھیں۔ وہ تو جیسے بستر سے لگ گئیں۔ ان کی بیماری کی ایک نہیں دو دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہی بسمہ والا معاملہ۔ وہ کئی بار بے حد دکھی لہجے میں کہہ چکی تھیں، یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں...... ان

کی پریشانی کی دوسری وجہ بڑی بیٹی بتول کے گھریلو حالات بھی تھے۔ وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ ملتان میں وہ اپنے سسرال میں زیادہ خوش نہیں تھی۔ شوہر غیاث سخت مزاج کا تھا اور کسی وقت مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ دو تین دفعہ وہ ناراض ہو کر میکے آ گئی تھی مگر پھر صلح ہو جاتی تھی اور شوہر اسے لے جاتا تھا۔

ابا اور تایا جان بار بار گجرات جا رہے تھے۔ کسی وقت ان کے ساتھ بڑے ماموں بھی ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میں نور کے ابا جان کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف بھی ہوئی اور وہ گھر آنے کے بجائے اسپتال پہنچے۔ اس دن نور کی امی بڑی آزردہ تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہمارے بڑے کہا کرتے تھے کھاریوں سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہ رکھنا۔ یہ کھوٹے اور خطرناک لوگ ہیں۔ پر تیری دادی......''
وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

نور نے ماں کو ذرا کریدا تو انہوں نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب تیری دادی کا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ ان کی کھاریوں کی وڈی ماں سے اتنی دوستی ہوتی اور نہ یہ مصیبت ہمارے گلے پڑتی۔''

نور اب قدرے سیانی ہو چکی تھی۔ اب اسے بات کو کریدنا اور اس کی تہ تک پہنچنا آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''امی! اگر چودھری طغرل کی ماں کے ساتھ ہماری دادی کا اٹھنا بیٹھنا تھا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ ہم نے کھاریوں کو آپی بتول کے رشتے کے لیے زبان دے دی تھی؟''

''یہ بات کافی پیچھے تک گئی ہوئی ہے نور۔'' والدہ نے کہا۔ ''یہ دونوں عورتیں سہیلیوں کی طرح تھیں۔ اس وقت تیری آپی بتول کی عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ کھاریوں کی ماں نے بتول کو کھیلتے دیکھا اور کہا کہ اسے تو میں اپنے پوترے ابدال کی ووہٹی بناؤں گی۔ بس اتنی سی بات تھی جو بنتے بنتے جھگڑا بن گئی۔ کھاریوں کے ساتھ تمہارے ابا اور تایا کا کوئی زمین کا جھگڑا بھی تھا لیکن یہ جھگڑا دونوں عورتوں کی دوستی اور میل جول کے نیچے دبا رہا۔ کھاریوں کو اس بات کا لالچ تھا کہ جب بتول کا رشتہ مل جائے گا تو وہ زمین بھی خود بخود ان کے پاس چلی جائے گی جس کا جھگڑا تھا۔ بتول ویسے بھی شکل صورت کی اچھی تھی۔''

نور نے کہا۔ ''اباجی اور تایا جی کو ان ساری باتوں کا پتا نہیں تھا؟''

''پتا تھا لیکن اس وقت یہ تو پتا نہیں تھا کہ طغرل کے پتر بڑے ہو کر اسے طرح کے نکلیں گے۔ بہرحال تمہارے ابا نے کبھی بھی منہ سے اس رشتے کے لیے اقرار نہیں کیا تھا۔ ہاں کھاریوں کی وڈی ماں زورا زوری کرتی رہی۔ کبھی بتول کے کپڑے لے آتی، کبھی عید شب برات شروع کر دی۔''

اب بات کافی حد تک نور کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد باغ والی زمین کا جو جھگڑا شروع ہوا، اس کی وجہ آپی بتول کی شادی ہی تھی اور اب بات وہیں تک نہیں رکی تھی۔ وہ لوگ ان کے اباجی کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ ان کو دیں، اسے یہ بھی پتا چلا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد ایک اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابدال کا بڑا چاچا ایم پی اے بن گیا تھا۔ انہیں سیاسی اثر رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب آپی کے بعد وہ بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع ہو گئے تھے۔

تین چار ہفتے کافی تناؤ میں گزرے پھر یہ معاملہ کچھ سدھر گیا۔ اباجی بھی اب بہتر تھے لیکن اس سارے تصفیے نے ایک نقصان کر دیا تھا اور یہ کافی بڑا نقصان تھا۔ نور نے اپنی والدہ کو کھو دیا تھا۔ تناؤ بھرے دنوں میں ایک دن ایسا آیا جب ان کا ایک پہلو بے جان ہو گیا۔ ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئیں۔

ان کی وفات نے نور اور بسمہ کو جیسے بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ والد نے تو ہمیشہ ان سے تھوڑا فاصلہ رکھا تھا، یہ والدہ ہی تھیں جو ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک رہتی تھیں اور تینوں بیٹیوں کے ہر طرح کے مسائل کا حتی المقدور سامنا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ نور ہر وقت غم اور اداسی کے ایک نادیدہ حصار میں رہنے لگی۔ میٹرک کا فائنل امتحان سر پر تھا مگر وہ پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اسپورٹ والی سرگرمی بھی ایک دم ماند پڑ چکی تھی۔ ویسے بھی وہ امتحان کے لیے اسکول سے فارغ ہو چکی تھی۔

ایک روز اسپورٹس کی ٹیچر مسز وجدان بالکل غیر متوقع طور پر ان کے گھر آن پہنچیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس وقت نور کے ابا جان گھر میں موجود نہیں تھے ورنہ جونہی مسز وجدان نے اپنا تعارف کرانا تھا ابا جان کا پارہ چڑھنا شروع ہو جانا تھا۔ مسز وجدان نے نور کے ساتھ دیر تک دلجوئی کی باتیں کیں۔ پھر اس کے بڑے ماموں مراد کو بھی بلا لیا۔ مسز وجدان نے نور کے ماموں مراد اور بہن بسمہ کو بتایا کہ نور میں ایتھلیٹکس کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے بڑا افسوس ہوگا اگر کسی وجہ سے نور کا ٹیلنٹ ضائع ہو جائے۔ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں

کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگر نور کے والد صاحب کے ذہن میں کچھ تحفظات ہیں تو آپ لوگ ان سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں۔''

ماموں مراد بولے۔ ''ٹیچر! ہم نور کے حوالے سے آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہیں مگر ہر گھر کے اپنے معاملات اور مسائل ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بھائی جان سے بات کرنے کا کچھ فائدہ ہوگا۔ یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی..... اس حوالے سے خاموشی ہی بہتر ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ نور خاموشی سے رننگ میں حصہ لیتی رہے؟''

''جی ہاں۔ اگر اسے شوق ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ یہ اس کے لیے اچھا شوق ہے تو پھر یہ شوق خاموشی سے بھی پورا ہو سکتا ہے۔''

مسز وجدان نے نور کو مجبور کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی ان سے رابطہ کرے اور فراغت کے ڈھائی تین ماہ میں اپنی ٹریننگ کو آگے بڑھائے۔

نور مناسب قد اور چھریرے جسم کی مالک تھی۔ رنگ بچپن میں گندمی تھا لیکن اب کافی کھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نقوش بھی جاذب تھے۔ گو بسمہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی مگر اس کی کمی نور کے نہایت متناسب جسم اور الھڑ پن نے پوری کر دی تھی۔ یہ نوخیز شباب کے دن تھے، اس کے جسم سے جیسے توانائی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ڈٹ کر کھاتی تھی مگر بھاگ دوڑ کے سبب یہ خوش خوراکی اس کے ''فگر'' کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔

امتحانات کے بعد نور خاموشی سے مسز وجدان کے پاس ان کی ٹریننگ اکیڈمی میں جاتی رہی۔ مسز وجدان چند سال پہلے تک خود بھی نیشنل لیول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی تھیں اور انہوں نے ریس کے کئی اہم ایونٹس جیت رکھے تھے۔ انہیں نور میں ایسا اسپارک نظر آ رہا تھا جو اس کو آگے لے جا سکتا تھا۔ نور نے بسمہ سے مشورے کے بعد ابا جان اور دادی کو یہی بتایا تھا کہ وہ کوکنگ کا ایک کورس اٹینڈ کر رہی ہے اور یہ سفید جھوٹ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ایک کوکنگ کے اسکول میں جاتی تھی مگر وہاں سے فوراً مسز وجدان کی اکیڈمی میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے جوتے اور ٹریک سوٹ وغیرہ بھی وہیں پڑے رہتے تھے۔ وہ بڑی لگن سے سیکھ رہی تھی۔

میٹرک کا امتحان نور نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ تاہم اس دوران میں اسے رننگ میں کئی چھوٹی چھوٹی کامیابیاں ملیں۔ اس کا اعتماد بڑھنے لگا۔ کھیل کے حوالے سے اس پر ایک جنون سا سوار ہونے لگا۔ اس نے ان بڑے ملکی اور غیر ملکی رنرز کے بارے میں پڑھا جنہوں نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا اور کامرانیاں سمیٹیں۔ اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہونے لگی۔ وہ جب جب آپی کی تلخ گھریلو زندگی کو دیکھتی تھی اور اپنی مرحومہ ماں کے کٹھن زدہ روز و شب کو یاد کرتی تھی، اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا شوق فزوں تر ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے یہی لگا تھا کہ وہ ایک چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مختلف تھی اور بات فقط دونوں بہنوں کی ہی نہیں تھی وہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں سے بھی مختلف تھی۔ گڑیوں سے کھیلنا اسے بچپن اور لڑکپن میں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کپڑوں کا بھی بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ خوامخواہ شرمانا، چلمنوں کے پیچھے چھپنا، لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر خود کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کرنا، بات بات پر اوئی اللہ..... ہائے اللہ مرگئی..... جیسے جملوں کا استعمال اور ناز و نزاکت کے سارے انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ اس نادیدہ حصار کو توڑنا چاہتی تھی جو موراں والی گاؤں کی اکثر لڑکیوں کے اردگرد موجود تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے پر دیے گئے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی اس کی ماں اور آپی کی زندگی سے بہت مختلف ہو سکتی ہے۔

پچھلے پانچ چھ ماہ میں اس نے کئی چھوٹے بڑے میڈل اور کپ جیتے تھے۔ وہ یہ سارے انعامات گھر کے بیسمنٹ میں موجود امی جان کی ایک پرانی جستی پیٹی میں لحافوں کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ بسمہ کے علاوہ کسی کو اس کلیکشن کا پتا نہیں تھا۔

دو سال پہلے بسمہ کو تو کالج میں داخلہ مل گیا تھا مگر جب نور کی باری آئی تو ابا جان نے برملا کہہ دیا کہ وہ کالج نہیں جائے گی۔ ان کے سخت رویے کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر وقت نور کی طرف سے چونکے رہتے تھے۔ ایک روز جب نور... کوکنگ اسکول سے (اور دراصل مسز وجدان کی اکیڈمی) واپس گھر آئی تو دادی اور ابا جان میں بات چیت ہو رہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے کچھ اڑتے اڑتے فقرے نور کے کانوں میں بھی پڑے۔ دادی نے کہا۔ ''توبہ یا اللہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا ہم نے۔ لڑکیاں اکیلی گھومنے نکلتی ہیں اور جب دل چاہے واپس آتی ہیں۔ کوئی پوچھنے بتانے والا نہیں۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں اشفاق! تیری اس چھوٹی کے کچھن ٹھیک نہیں۔ اس کو ذرا سنبھال کر رکھ۔ لڑکوں

کی طرح کدا ڑے مارتی پھرتی ہے۔لڑکیوں بالیوں والی کوئی شرم کوئی نزاکت ہی نہیں اس میں۔"

"اماں جی! آپ جانتی ہیں، شروع سے ہی ایسی ہے وہ۔اب بڑی ہورہی ہے،طور طریقے بھی آجائیں گے۔"

"آئے ہائے...... اور کتنی بڑی ہوگی۔ کوٹھے جتنی ہوگئی ہے۔کل سیڑھیوں پر یوں چڑھ رہی تھی، جیسے کوئی گھوڑی دولتیاں مارتی ہوئی جارہی ہو۔ نہ سر پر دوپٹا نہ پاؤں میں جوتی۔ میں تو کہتی ہوں بتول کی طرح اسے بھی گھر میں ہی بارھویں کروادے۔"

"سوچ تو یہی رہا ہوں اماں جی! پر اب بسمہ کالج جارہی ہے۔ بھائی خلیل کے سارے بچے جارہے ہیں...... وہ کہے گی، مجھ پر ہی پابندی کیوں؟"

"خلیل کی بات تو چھوڑ دو۔ وہ تو ویسے ہی اپنی آخرت کو بھلا کے بیٹھا ہوا ہے۔ حج کرکے بندہ دنیاداری سے دور ہوجاتا ہے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیسے کے پیچھے جو دوڑ پہلے تھی، وہ اب بھی ہے۔ راحت کو دیکھ لے، اسی طرح پتلی سی چادر لے کر بازار چلی جاتی ہے۔ کہتی ہے اب بوڑھی ہوگئی ہوں۔ پر شادی بیاہ پر اس کی تیاریاں دیکھو تو کہیں بڑھاپا نظر نہیں آتا۔"

نور برا سامنہ بنا کر وہاں سے ہٹ آئی تھی۔

کالج میں داخلے کا معاملہ بہ دستور اٹکا ہوا تھا۔ اس مرتبہ پھر تایا خلیل کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ کچھ کردار بسمہ اور بڑے ماموں مراد نے بھی ادا کیا۔ نور کو اس شرط پر بمشکل اجازت ملی کہ بڑے ماموں اسے خود کالج چھوڑ کر آیا کریں گے اور لایا بھی کریں گے۔ کالج ان کے شوروم کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔

☆☆☆

کالج میں پہنچنے سے پہلے ہی نور کی تھوڑی بہت شہرت کالج میں بھی پہنچ چکی تھی۔ کئی ایک اسٹوڈنٹس جانتے تھے کہ وہ ایک اچھی ایتھلیٹ ہے۔ اس کی اسپورٹ ٹیچر بھی اس کے نام سے شناسا تھیں۔ ایک فائدہ نور کو یہ ہوا کہ نئی ٹیچر فرحانہ بیگ ذاتی طور پر مسز وجدان کی دوست بھی تھیں۔ فرحانہ بیگ نے شروع میں ہی نور پر خصوصی توجہ دینا شروع کردی۔ اسے ٹیم میں شامل کرلیا گیا اور وہ مراعات بھی دی گئیں جو ایک ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کے لیے ضروری تھیں۔ مسز وجدان اور فرحانہ بیگ کی ہدایت کے مطابق نور مختلف ٹرائلز میں بھی شرکت کررہی تھی۔ فرحانہ بیگ بہت اچھی کوچ بھی تھیں۔ ایک روز فرحانہ بیگ اور منیجر الیاس صاحب نے اسے خوشخبری سنائی۔ انہوں نے کہا۔"تمہارے لیے ڈیپارٹمنٹل ٹیم میں شامل ہونے کا زبردست چانس بن رہا ہے۔"

"ڈیپارٹمنٹل ٹیم؟" نور نے ذرا حیرت سے کہا۔

"بھئی اکثر سرکاری اور غیر سرکاری محکمے اچھے کھلاڑیوں کو ملازمت دیتے ہیں اور انہیں "گروم" کرتے ہیں۔ تمہیں واپڈا کی سروس کا موقع مل رہا ہے۔" فرحانہ بیگ نے ایک لیٹر نور کے سامنے رکھ دیا۔

اس لیٹر کے مطابق لاہور سے پانچ چھ ایتھلیٹ لڑکیوں کو ٹرائل اور انٹرویو وغیرہ کے لیے اسلام آباد بلایا گیا تھا۔ ان میں نور کا نام بھی تھا۔

نور نے لیٹر پڑھنے کے بعد کہا۔"لیکن میڈم! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے......"

"اوہو، چھوڑو اس بات کو۔ ابھی انہیں کچھ نہ بتاؤ، تم ٹرائل وغیرہ تو دو۔ یہ کوئی معمولی موقع نہیں ہے۔ کامیاب ہوگئی تو ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملنا شروع ہوجائے گا۔ پھر دیکھ لینا جس طرح بھی کرنا ہوگا۔"

"مگر میڈم! یہ بات چھپی تو نہیں رہے گی بلکہ...... میرا تو اسلام آباد جانا ہی ممکن نہیں ہوگا۔"

"صرف دو دن کی بات ہوگی۔ بہن اور ماموں کو بتادو۔ والد صاحب کو ابھی نہ بتاؤ۔ انہیں کالج کے تفریحی ٹور وغیرہ کا کہہ دو۔ خدانخواستہ تم کوئی غلط کام تو نہیں کررہی ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی صلاحیت دے رکھی ہو تو اسے استعمال نہ کرنا بھی بہت بڑی ناشکری ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے والد بھی جلد یا بدیر اس بات کو سمجھ جائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اور پرنسپل صاحب کسی دن اکٹھے ان سے ملاقات کریں اور انہیں تمہارے حوالے سے قائل کریں۔"

"مگر میڈم......"

"دیکھو نور!" میڈم فرحانہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کہتے ہیں کہ بچے کا ایک باپ وہ ہوتا ہے جو اسے آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور دوسرا باپ استاد ہوتا ہے جو اسے زمین سے اٹھاتا ہے اور بلندی پر پہنچاتا ہے۔ کیا تم اپنے اساتذہ کو یہ درجہ نہیں دیتی ہو؟"

اس روز میڈم فرحانہ نے اسے نوے فیصد قائل کرلیا۔ وہ خیالوں میں الجھی اور ایک چمکیلے مستقبل کا سوچتی ہوئی سہ پہر کے بعد پہنچی۔ تاہم گھر پہنچ کر اسے ایک نئی طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ دادی اماں اور پھپھو حاجرہ اسے مختلف

نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ابا جان بھی گھر میں ہی موجود تھے۔ کچن سے بریانی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آج نور نے ذرا لمبی ٹریننگ کی تھی۔ اس کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اس نے بسمہ سے پوچھا۔ ''کھانا تیار ہے؟''

بسمہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کھانا تو دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جائے گا لیکن مہمان ابھی نہیں آئے۔''

''کون سے مہمان؟'' نور نے سلاد پر منہ مارتے ہوئے کہا۔

''تیرے مہمان۔''

''میرے مہمان؟ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون آ رہا ہے بھئی؟''

بسمہ کی مسکراہٹ جو پہلے ہی پھیکی سی تھی کچھ اور بھی پھیکی ہو گئی۔ وہ شاید بولنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی جب پھپھو حاجرہ اندر آئیں۔ نور کو گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ بسمہ کنی کترا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ نور حیرت زدہ تھی۔ ساتھ والے کمرے سے ابا جان کے کھنکھارنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھپھو حاجرہ نے بڑے دلار سے کہا۔ ''نور! اچھے رشتے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک رشتہ مل جانا، اللہ کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اب دیکھ لے تیری خالہ کی تینوں بیٹیاں ستائیس اٹھائیس سال سے اوپر کی ہیں اور اسی طرح بیٹھی ہیں۔''

''پھپھو! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' کم سن نور کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔ پھپھو بولیں۔

''اچھا رشتہ آیا ہے۔ تیرے اباجی کے جاننے والے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ عالم دین ہیں، ان کا بڑا بیٹا ذوالقرنین۔ تیرے اباجی کی شاپ کے ساتھ ہی اس کی شاپ بھی ہے۔ اسلامی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کا کام کرتا ہے۔ اچھی آمدن ہے۔ اپنا گھر ہے۔ صرف ایک جڑواں بہن ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔ بالکل چھوٹی سی فیملی ہے۔ یہ دیکھو۔''

پھپھو نے ایک کارڈ سائز تصویر نور کے سامنے کر دی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ تئیس چوبیس سال کا نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ کہنے کو قبول صورت کہا جا سکتا تھا مگر چہرے پر عجیب طرح کی سنجیدگی اور سختی تھی۔ جیسے ہر چیز سے بیزار بیٹھا ہو۔

نور نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ تصویر میز پر رکھ دی اور اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ اس کے جسم کا سارا خون جیسے اس کے سر کی طرف یلغار کر رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' پھپھو نے پوچھا۔

نور نے اشک بار نظروں سے پھپھو کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یہ...... یہ آپ لوگ کس طرح کا مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا...... شادی بیاہ کی بات ...... اس طرح کی جاتی ہے۔ نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا نہ کچھ بتایا۔ میں نے ......'' اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھپھو نے گھبرا کر اسے کندھوں سے تھاما اور دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔ ''نور پتر! تیرے اباجی گھر میں ہیں۔ ان کے کانوں تک آواز نہ چلی جائے۔ میری بات سن، ذرا ٹھنڈے دل سے......''

''نہیں پھپھو...... نہیں ...... میں نے کچھ نہیں سننا۔ میں نے یہ شادی نہیں کرنی۔'' وہ باقاعدہ رونا شروع ہو گئی۔ حالانکہ وہ بہت کم روتی تھی مگر آنسو جیسے بھرا مار کر اس کی آنکھوں تک آئے تھے اور آنکھوں میں ہی نہیں پورے جسم میں رواں ہو گئے تھے۔

اب بسمہ بھی اندر آ گئی تھی۔ شاید وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے نور کو اپنے ساتھ لگایا اور ہراساں لہجے میں بولی۔ ''نوری...... نوری! چپ ہو جا اباجی نے سن لیا تو مصیبت آ جائے گی۔'' شاید بسمہ کے اشارے پر ہی پھپھو نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

بریانی کی خوشبو اب بھی نتھنوں تک پہنچ رہی تھی مگر اب یہ گندھک کی بو کی طرح نور کی ناک اور اس کے گلے کو چھیل رہی تھی۔ وہ بسمہ کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے بسمہ! تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... کیا تم بھی اس سارے کھیل میں شریک ہو...... کیا تم بھی یہی چاہ رہی ہو؟''

بسمہ بولی۔ ''نہیں نور! مم ...... مجھے بھی ابا جان نے کل دوپہر ہی بتایا تھا...... اور تمہیں سمجھانے کے لیے کہا تھا لیکن سچی بات ہے میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی تم سے بات کرنے کی ...... اور پھر رات کو وہ مجھے بازار لے گئے۔ میں واپس آئی تو تم سو رہی تھیں۔''

پھپھو بولی۔ ''ان باتوں کو چھوڑو۔ تم سب کو پتا ہے کہ ہونا تو اس گھر میں وہی ہے جو تمہارے اباجی چاہتے ہیں اور ماں پیو کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ لڑکے کی ماں اور بہن نے پچھلے مہینے تمہارے حفیظ انکل کی شادی پر تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ بات چیت چل رہی تھی۔''

''کیوں چل رہی تھی بات چیت ...... ہاں کیوں چل رہی تھی؟'' نور تڑخ کر بولی۔ ''کس نے پوچھا تھا مجھ سے؟

کس نے بات کی تھی؟ اباجی خود کہتے ہیں، اسلام میں بیٹیوں کو حق دیے گئے ہیں۔ میرا حق کہاں تھا؟ میرا حق کہاں ہے؟ اور یہ کیا بات ہے کہ کالج سے گھر آؤ تو آگے آپ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور ابھی تو مجھ سے آگے بسمہ ہے۔ اباجی کے جاننے والوں کو وہ کیوں نظر نہیں آتی؟ انہوں نے مجھ پر ہی کیوں نشانہ لے لیا ہے؟''

''ناشکری کی باتیں نہ کر۔'' پھپھو پہلی بار غصے میں بولی۔ ''ہر ایک کا مقدر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بسمہ بھی... اِنخواستہ کوئی لولی لنگڑی نہیں ہے۔ دیکھنا دو چار ماہ میں اس کا بھی بڑا چنگا بر مل جائے گا۔ بھائی اشفاق تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔''

''فرض سے نہیں بوجھ سے۔ شاید ہم بوجھ ہیں ان کے لیے۔ وہ ہمیں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔'' نہ چاہنے کے باوجود نور کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب دروازے پر دستک ہوئی اور تینوں عورتیں ٹھٹک گئیں۔ بسمہ کا رنگ جلدی ہو رہا تھا۔ باہر سے اباجی کی بھاری آواز سنائی دی۔

''بسمہ! تیار ہو گئی ہے عین النور؟''

''ہاں اباجی ہو رہی ہے۔''

''جلدی کرو بھئی! وہ لوگ آنے والے ہیں۔'' اباجی نے ملامت سے کہا۔

ان کے قدموں کی مدھم چاپ ابھری۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نور ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے اتنا حوصلہ، اتنی ہمت اور جرأت اچانک اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اندر تھی اور ابا جان باہر۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جالی دار کھڑکی تک پہنچی اور کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ 'اباجان۔'

وہ ٹھٹک کر رک گئے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

''نور! کیا بات ہے؟'' انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

چند لمحوں کے نہایت بوجھل وقفے کے بعد نور نے کہا۔

''اباجان! آپ...... ابھی...... میری کوئی بات نہ کریں۔''

مولوی اشفاق مہرا کے چہرے پر جیسے حیرت اور طیش کا دریا بہہ گیا۔ وہ بولے۔ ''م م...... میں سمجھا نہیں...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''اباجان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے مگر میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ میری بات نہ کریں۔'' اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ نور کو خود یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کھڑکی کی اوٹ سے یہ الفاظ اپنے والد سے کہہ چکی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے لمحے تھے جنہوں نے اس طرح کی جرأت اسے عطا کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں اس کی والدہ مرحومہ کی ساری گھٹن زدہ زندگی سمٹ آئی ہے اور اپنی آپی بتول کی ازدواجی زندگی کی ساری تلخیاں بھی اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ہاں، یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ مولوی اشفاق مہرا تیزی سے دروازے کی طرف پلٹے۔ اگلے ہی لمحے دروازے کے تختے اس طرح دھڑ دھڑائے جیسے پورا دروازہ دیواروں سے نکل کر کمرے میں آ گرے گا۔ ''دروازہ کھولو، بسمہ دروازہ کھولو۔'' وہ خوفناک آواز میں دہاڑے۔

بسمہ نے سہمی ہوئی نظروں سے پھپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''بھائی جان! ہم اسے سمجھا رہے ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''میں کہتا ہوں دروازہ کھولو، ورنہ میں توڑ دوں گا۔''

مولوی اشفاق کی آواز پورے گھر میں گونجی۔ وہ جیسے پھٹ پڑے تھے، شاید ان کا ''بی پی'' بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے دروازہ نہ کھولا تو مولوی جی کا طیش مزید بڑھے گا اور نتائج مزید برے نکلیں گے۔ پھپھو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

مولوی اشفاق کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ہاکی کا دستہ تھا۔ اندر آتے ساتھ ہی وہ جیسے نور پر پل پڑے۔ وہ چلاتی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔ دستے کی ضربیں اس کے جسم پر تواتر سے لگ رہی تھیں۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ مولوی اشفاق دہاڑ رہے تھے۔ ''بدبخت! زبان چلاتی ہے...... میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔''

بسمہ تڑپ کر باپ کے سامنے آ گئی۔ ''اباجی نہیں...... پلیز اباجی......''

اس نے کئی چوٹیں اپنے ہاتھوں پر سہیں۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ناخنوں سے خون بہہ نکلا۔ پھپھو بھی اپنے طور پر انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی سمیت گھر میں موجود دیگر افراد بھی ہانپتے کانپتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ مولوی اشفاق غم و غصے کے عالم میں گرج رہے تھے۔ ''تیری یہ جرأت...... تیری یہ ہمت...... بے شرم بے حیا...... اپنے باپ کے منہ پر کالک مل رہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے مجھے۔ اپنے

ہاتھوں سے ذبح کر ڈال مجھے۔"

وہ پھر نور کی طرف جھپٹے۔ بڑے ماموں نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

دادی نوحہ کرنے والے انداز میں پکاریں۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا، اس کلموہی نے ایک نہ ایک دن کوئی چاند چڑھانا ہے۔ یہ ہماری جانیں لے کر رہے گی۔ میں پہلے ہی کہتی تھی، اس بے شرم کو کالجوں کی ہوا نہ لگواؤ۔ دس دس گھنٹے غائب رہتی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا کرتی پھر رہی ہے۔ اس گھر میں کوئی میری بات سنتا ہو تو پھر ہے نا۔ ہائے اللہ، یہ مجھے کیا دیکھنا پڑ رہا ہے......"

نور ایک کونے میں گٹھڑی بن کر سمٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کالج کی سفید یونیفارم پر خون کے داغ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ وہی خون تھا جو اس کا سر پھٹنے سے بہا تھا۔ اس کی گھٹی گھٹی آواز ایک دردناک فریاد بن کر کمرے میں گونج رہی تھی۔

ماموں مراد نے نور کے اباجی کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور انہیں بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ان کی ٹوپی گر گئی تھی اور عینک ناک کے آخری سرے تک سرک آئی تھی۔ وہ دہاڑے۔ "شام تک اس خبیث کو سمجھا لو اگر سمجھتی ہے تو...... ورنہ پھر وہ ہوگا جو اس خاندان میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ میں مر جاؤں گا یا اس کو مار ڈالوں گا۔"

پورا گھر ایک طوفان کی زد میں تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ نور کے ابا جان نے کسی ایمرجنسی کا بہانہ کر کے مہمانوں کو فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع سن کر تائی جان اور مہرین وغیرہ بھی بھاگے آئے تھے۔ نور کو گھر میں ہی طبی امداد دی گئی اور اس کے سر سے مسلسل بہنے والا خون روکا گیا۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ تایا خلیل لاہور میں موجود نہیں تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر بات کو سنبھال لیا کرتے تھے۔

بسمہ نے گلوگیر آواز میں تائی جان راحت سے کہا۔

"بڑی امی! آپ بڑے ابا کو فون کریں۔ انہیں کہیں وہ آج ہی واپس آجائیں۔"

"پتا نہیں کہ رابطہ ہوتا ہے یا نہیں۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ انہیں بتائیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر جا کر خود انہیں فون کر لیتی مگر میں چاہتی ہوں کہ یہاں نور کے پاس رہوں۔"

تائی جان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ نور اور بسمہ کو تسلی دیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئیں تاکہ شوہر کو فون کر سکیں۔ پھپھو مسلسل نور کو سمجھانے بجھانے میں لگی ہوئی تھیں۔ گاہے بگاہے دادی بھی کوئی کڑوا کسیلا لقمہ دے دیتی تھیں۔ دادی پرانے خیال کی عورت تھیں اور ان کی سوچ یہی تھی کہ لڑکیوں کو سات آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر گرہستی سیکھ لینی چاہیے اور ان کی شادی جلدی کر دینی چاہیے۔ دادی کی اپنی شادی فقط پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور وہ پردے کی اتنی پابند تھیں کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہوں نے ساری عمر اپنے سسر اور جیٹھوں کو اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔

وہ بار بار کہہ رہی تھیں۔ "نوری! تیرے پیو کا غصہ بڑا بھیڑا ہے۔ اگر تو نے اس کی بات نہ مانی تو اس نے جان سے مار دینا ہے تجھے۔ پھر اس راحت بی بی (تائی) نے تجھے بچانے کے لیے نہیں آنا۔"

پھپھو حاجرہ بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہہ رہی تھیں مگر پتا نہیں کہ نور کو کیا ہوا تھا۔ مار کھانے کے بعد اور باپ کی ٹھوکریں سہنے کے بعد نور کے اندر کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک باغی سر اٹھا رہا تھا۔ اپنے والد اور اپنی دادی کا باغی، اپنے اردگرد کے حالات کا باغی، اس باغی سے آج سے پہلے نور کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔

دوسرے کمرے سے ابھرنے والی دادی کی آواز مسلسل نور کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ اب اس کی مرحومہ ماں کو مجرم ٹھہرا رہی تھیں۔ ان کی تربیت کو ناقص گردان کر نور کو ان کا پرتو قرار دے رہی تھیں۔

پھپھو انہیں ایسی تلخ باتیں کرنے سے روک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی ہمنوائی بھی کر رہی تھیں۔ ابا جان نے شام تک کا الٹی میٹم دیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ شام کے فوراً بعد ہی تایا جان گجرات سے لاہور پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ان کے گھر ہی آئے تھے...... انہوں نے ہمیشہ نور سے بہت پیار کیا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا سر، زخمی کلائیاں اور سوجی ہوئی آنکھ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے سرخ و سپید چہرے پر بس سرخ رنگ ہی باقی رہ گیا۔ نور کا خیال تھا کہ شاید تایا کو دیکھ کر وہ رو پڑے گی لیکن آنسو جو بہت کم ہی اس کی آنکھوں تک آتے تھے، اب بالکل روٹھے ہوئے تھے۔ بس آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے اور ایک انگارہ سا تھا جو سینے میں دھرا ہوا تھا۔

نور کے سر پر پیار دے کر تایا جان دوسرے کمرے

میں ابا جان سے ملنے چلے گئے۔ بسمہ نے جلدی سے کوریڈور اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے اتنی بلند ہوگئی کہ دونوں دروازے بھی اس کی گونج کو نہ روک سکے۔ نور کے ابا جان بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتے تھے مگر آج تو وہ بھی ان کے سامنے بول رہے تھے۔ تایا کی آواز زیادہ بلند تھی اور پھر وہ بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اڑتے اڑتے کچھ الفاظ بسمہ اور نور کے کانوں تک بھی پہنچے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''بہت افسوس ہے اشفاق! بہت افسوس ہے۔ تم اپنی ہی بچی کے بارے میں ایسی غلط سوچ رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کے گلے میں پھندا ڈال کر مار دو اسے یا زندہ گاڑ دو زمین میں۔''

''خدا کے لیے بھائی جان! مجھے بولنے پر مجبور نہ کریں۔ یہ آپ لوگوں کا لاڈ پیار ہے جس نے اس کو اس حال تک پہنچایا ہے۔''

''کس حال تک پہنچایا ہے؟ کیا کر دیا ہے اس نے؟ مجھے بتاؤ کون سی قیامت توڑ دی ہے اس نے؟ تم سے جینے کا حق ہی مانگ رہی ہے نا۔ یہی کہہ رہی ہے نا کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر شادی اور بال بچے کی ذمے داری نہ ڈالو اور کیا کہہ رہی ہے وہ؟''

''بھائی جان! آپ کو کچھ معلوم نہیں۔'' نور کے ابا جان نے قدرے دبی آواز میں کہا۔ ''اس کے طور طریقے بہت بدل گئے ہیں۔ یہ دیکھیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ یہ دیکھیں ...... یہ ہے اس کا سامان جو نیچے پرانی پیٹی سے نکلا ہے...... یہ بھی دیکھیں......''

دھاتی اشیا کے گرنے اور پٹخے جانے کی آوازیں آئیں۔ ایک لمحے میں نور کو اندازہ ہوگیا کہ بیسمنٹ میں موجود اس کے کپ اور ٹرافیاں وغیرہ ابا جان کی نظر میں آ چکے ہیں ...... اور آج دوپہر سے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہاتھ ان چیزوں کی برآمدگی کا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ چکر کتنے دنوں سے چل رہا تھا۔

''تو کیا ہے اشفاق؟'' تایا جان کی بلند آواز دروازوں سے گزر کر نور اور بسمہ کے کانوں تک پہنچی۔ ''کون سا گناہ کر دیا ہے اس نے۔ کون سی ایسی حرکت کی ہے جس سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟ میں پھر کہتا ہوں اشفاق! اس طرح کا کٹر پن تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم اللہ کے احکام کو مانتے مانتے اللہ کے احکام سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''بھائی جان! میں اس بارے میں آپ سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔''

''مگر میں کرنا چاہتا ہوں۔'' تایا خلیل گرجے۔ ''مجھے بتاؤ، اپنی روتی سسکتی بچی کو مار کوٹ کر کسی کی ڈولی میں دھکیلنے کا حق کس نے دیا ہے تمہیں؟''

آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ شاید درمیان میں موجود کوئی اور دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا لیکن یہ اندازہ تو ضرور ہو رہا تھا کہ ابا اور تایا میں زوردار تکرار چل رہی ہے۔ چار پانچ منٹ مزید گزرے پھر تایا جان غصے سے بھرے ہوئے ...... تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کونے میں دبکی نور کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ''چل میری بچی! یہ گھر تیرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اندھا بہرا ہوگیا ہے اس گھر کا سربراہ۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔''

پھپھو نے تایا خلیل کو روکنا چاہا پر انہیں بھی زوردار کی ڈانٹ کھانا پڑی۔ تایا بولے۔ ''بس، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ میرے پاس رہے گی جب تک تم لوگوں کے دماغ ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں رکھوں گا اسے۔''

قریبی کمرے سے نور کے ابا جان کی دبی دبی مگر تلخ آواز ابھری۔ ''لے جائیں ...... لے جائیں اس تحفے کو۔ میں بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھوں گا یہ مر گئی ہے میرے لیے۔''

☆☆☆

اس دن کے بعد نور کے سارے روز و شب ایک دم بدل گئے۔ تایا ابا اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔ تایا کی طرح تائی راحت نے بھی ہمیشہ اس سے بہت پیار کیا تھا۔ پھر تایا کے تینوں بچے، نور کے لیے بالکل بھائی بہنوں کی طرح تھے۔ وہ شرجیل، عثمان اور مہرین کے ساتھ ایک ہی گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ مہرین اس سے صرف ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی اور فزیوتھراپسٹ بن رہی تھی۔

تایا خلیل کافی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی کے لیے بھی ان کی بات کو رد کرنا یا ان سے طویل بحث مباحثہ کرنا ممکن نہیں تھا ...... اور نور کے ابا جان سے تو ان کا رشتہ بڑے بھائی کا بھی تھا۔ نور کے ابا جان مولوی اشفاق کے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ ایک حد سے زیادہ تناؤ پیدا کر سکیں۔ انہوں نے جیسے ایک دم نور

سے لاتعلقی سی اختیار کرلی۔ چار پانچ روز بعد ایک شام تایا ابا گھر آئے تو ملازم خدا بخش نے کینوس کا ایک بڑا سا بیگ کندھے پر لاد رکھا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ "لو بھئی نور! یہ میں تمہارے کپ اور ایوارڈ وغیرہ اس نامعقول کے قبضے سے نکال کر لایا ہوں۔" نامعقول سے ان کی مراد یقیناً چھوٹا بھائی ہی تھا۔

تایا ابا نے بیگ کی زپ کھولی...... اور اس میں سے ایک بڑا کپ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ کپ ٹیوب لائٹ میں چمک رہا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ "آج میری ملاقات تمہاری ٹیچر میڈم فرحانہ بیگ سے بھی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ نور اسلام آباد جائے گی اور میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ وہ بڑی خوش ہوئی ہے۔ اسے تم سے بہت زیادہ امیدیں ہیں اور بات صرف میڈم فرحانہ کی ہی نہیں، تمہارے اکثر ٹیچرز تمہیں ایک کامیاب ایتھلیٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔"

"پر تایا ابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے اباجی کو بہت ناراض کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان سے معافی مانگ لوں۔"

"جب معافی کا وقت آئے گا تو وہ بھی مانگ لینا لیکن یہ وقت معافی کا نہیں ہے۔ اس معافی کی کم از کم قیمت یہی ہوگی کہ وہ تمہیں کمرے میں بند ہونے پر مجبور کردے گا اور پھر چند روز میں تمہارا نکاح پڑھوا کر تمہیں کسی قاری ذوالقرنین کے حوالے کردے گا۔"

"لیکن تایا ابا......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" انہوں نے نور کی بات کاٹی۔ "میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرتی جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تائی راحت نے بھی اس کا شانہ سہلایا۔ مہرین دلچسپی اور حیرت سے نور کے درجنوں کپ اور ٹرافیاں دیکھ رہی تھی۔

دو روز بعد نور اپنے تایا جان کے ساتھ بذریعہ کوچ اسلام آباد گئی۔ اس نے ٹرائل میں حصہ لیا۔ اس کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔ اسے فوری طور پر ملازمت تو نہیں ملی تاہم اسے شارٹ لسٹ کرلیا گیا اور پوری امید دلائی گئی کہ وہ جلد ہی محکمے کی طرف سے کھیلتی ہوئی نظر آئے گی۔

اسلام آباد کے وزٹ سے نور کے اعتماد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ اسے سینئر ایتھلیٹس سے ملنے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس کے اندر زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ لاہور واپس آنے کے بعد نور نے باقاعدگی سے فرحانہ کے کوچنگ سینٹر جانا شروع کردیا۔ یہ سینٹر کئی برس پہلے فرحانہ بیگ نے کھیل سے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع کیا تھا۔ اس کا اصل نام "فرحانہ ایتھلیٹکس اسکول تھا"۔ اسے عام طور پر ایف اے ایس کہا جاتا تھا اور ایتھلیٹکس کے حلقوں میں اس کا نام تھا۔

میڈم فرحانہ بیگ اس ادارے کی روح رواں تھیں...... اور بڑی محنت سے لڑکیوں کو رننگ کی تربیت دے رہی تھیں۔ اپنے اسکول کی دوست شاہینہ سے بھی نور کا مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ شاہینہ کا تعلق ایک ایلیٹ کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے والد ایک کامیاب صنعت کار تھے۔ اس نے ایک ہائی فائی کالج میں داخلہ لیا تھا اور اسپورٹس میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ اکثر سو میٹر کی دوڑ میں دونوں سہیلیوں کا آمنا سامنا بھی ہوجاتا تھا۔ ان دونوں کی ٹائمنگ میں بس انیس بیس کا فرق ہی تھا۔ کسی وقت نور اور کسی وقت شاہینہ کی ٹائمنگ بہتر رہتی تھی۔

دونوں فرصت کے لمحات میں بے تکلف گفتگو بھی کرتی تھیں۔ شاہینہ بھی نور ہی کی طرح دراز قد اور اسمارٹ جسم کی مالک تھی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی دونوں شاید ہم پلہ ہی تھیں تاہم شاہینہ کے نسبتاً زیادہ خوش حال لائف اسٹائل نے اس میں اضافی نکھار پیدا کردیا تھا۔ کسی بھی ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کی طرح شاہینہ بھی مستقبل کے خوب صورت سپنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی اس کی پوری سپورٹ کررہے تھے......

ایک روز نور اپنے تایا ابا کے ساتھ ان کی سوزوکی کار میں ڈیفنس کی طرف شاہینہ سے ملنے جارہی تھی۔ تایا ابو ڈرائیو کررہے تھے۔ انہیں چار بجے تک شاہینہ کے گھر پہنچنا تھا اس لیے وہ گاڑی تھوڑی تیز چلارہے تھے۔ ایک چوراہے سے وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ حالانکہ انہوں نے اشارہ دے رکھا تھا پھر بھی غلط سمت سے اوورٹیک کرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے آ ٹکرایا۔ تایا نے بمشکل موڑ کاٹا اور گاڑی کو کنارے پر لگایا۔ موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں گرے اور تھوڑی بہت چوٹیں بھی آئیں۔ دوسری طرف گاڑی کے دونوں دروازوں پر بھی ٹھیک ٹھاک رگڑیں آئیں۔ تایا جان باہر نکلے تو لڑکوں نے ان سے بدتمیزی شروع کردی۔

تایا نے ایک کو دھکا دیا، وہ تایا سے کھینچا تانی کرنے لگے۔ نور بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے لڑکوں کو ہٹا

سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی' اسے بھی ایک زوردار دھکا کھانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب نور نے ایک دراز قد لڑکے کو دیکھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھوٹے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور حملہ آور لڑکوں کی طرف جھپٹا۔ ''اوئے کیا کرتے ہو۔ بزرگ آدمی ہیں۔'' وہ پکارا۔

''بزرگ ہے تو ساری سڑک کا ماماں بن گیا ہے یہ۔'' سرخ ٹی شرٹ والا لڑکا چلایا۔

اگلے ہی لمحے دونوں لڑکے دراز قد نوجوان سے گتھم گتھا ہوگئے۔ دراز قد نوجوان ورزشی جسم کا مالک تھا اور لگتا تھا کہ لڑائی بھڑائی سے بھی واقف ہے۔ اس نے سرخ شرٹ والے کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی تو وہ کراہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کے اوپر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے چند کے چلائے مگر پھر دراز قد نوجوان نے اسے اڑنگا لگا کر سڑک پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر اس کی اچھی خاصی دھنائی کرڈالی۔ موقع پر جمع ہوجانے والے لوگوں نے سرخ شرٹ والے کو پکڑلیا تھا۔ وہ اب بھی اچھل اچھل کر نور کے تایا جان اور دراز قد نوجوان کی طرف آنے کی کوشش کررہا تھا مگر اس کوشش میں اب زیادہ دم خم نہیں تھا۔ چند تماشائیوں نے سڑک پر گرے ہوئے دوسرے لڑکے کو دراز قد نوجوان کی گرفت سے چھڑایا اور اسے لعنت ملامت کی۔ اس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

دراز قد نوجوان کی قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا اور اس میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ جھانک رہا تھا۔ وہ نور کے پاس آیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔ ''آپ گاڑی میں بیٹھیں اور انکل آپ بھی بیٹھیں۔ آپ نکلیں یہاں سے، میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔''

''نہیں نہیں بیٹا لڑائی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس ان کو سبق مل گیا ہے۔ تم بھی جاؤ یہاں سے۔''

اسی دوران میں دور سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی سفید موٹر سائیکل کی جھلک دکھائی دینے لگی...... تایا جان نے دراز قد نوجوان سے کہا۔ ''ابھی ٹریفک والے آجائیں گے۔ تم جاؤ یہاں سے بیٹا۔ وہ دیکھو، وہ خبیث بھی نکل رہے ہیں۔''

''میں بھی چلا جاؤں گا لیکن آپ گاڑی میں بیٹھیں۔'' نوجوان نے بڑے اطمینان سے کہا۔

تایا ابا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، نور پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کافی آگے جاکر نور نے مڑ کر دیکھا۔ ان کا مددگار...... ٹریفک سارجنٹ سے بات چیت کررہا تھا۔ اس کے انداز میں زبردست اعتماد تھا۔

چند روز بعد انٹر کالجیٹ مقابلے شروع ہوگئے۔ یہ ایک بڑا ایونٹ تھا۔ ٹریننگ سینٹر میں میڈم فرحانہ نور کو بھرپور پریکٹس کروارہی تھیں۔ کافی سخت شیڈول تھا۔ ہفتے میں پانچ دن، کم از کم تین گھنٹے تک وہ سخت مشقیں کررہی تھی۔ پہلے وارم اپ ہوتا پھر جسم اور پٹھوں کو لچک دار بنانے والی ورزشیں ہوتیں۔ ان کو عرف عام میں اسٹریچنگ کی ایکسرسائز کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد رننگ کا سیشن ہوتا۔ اس تربیتی دورانیے کے علاوہ بھی نور بس دوڑ اور مقابلے کے بارے میں ہی سوچتی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی پریشان کن سوچوں کی طرف اس کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ ہاں، رات کو جب وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹتی تو ابا جان کی صورت نگاہوں کے سامنے آجاتی۔ ان کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکراتی۔ انہوں نے تایا جان سے کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے لے جائیں اس تحفے کو یہاں سے...... میں سمجھوں گا یہ مرگئی ہے میرے لیے۔''

پچھلے دو تین ہفتوں میں بس ایک بار بسمہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چوری چھپے کالج سے سیدھی تایا کے گھر آئی تھی اور نور سے ملی تھی۔ نور کو گلے لگا کر اس نے خوب آنسو بہائے تھے اور دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ابا جان نے انہیں نور کے ساتھ ملنے سے منع کردیا ہے۔

ایک دن اس کے لیے پھپھو حاجرہ کا فون آیا۔ وہ کسی پی سی او سے بات کررہی تھیں۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''نورا تیرے ابا جی، بہت پریشان ہیں۔ تم نے بہت دکھ دیا ہے انہیں۔ یاد رکھنا انہیں ناراض کرکے تو کبھی خوش نہیں رہ سکے گی، کسی بھی کام میں کامیابی نہیں ملے گی تجھے۔''

''میں کیا کروں پھپھو؟'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ ''وہ جس شرط پر مجھے معاف کریں گے، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ...... اور اپنی من مرضی سے۔ بالکل جس طرح انہوں نے آپی بتول کی شادی کی۔ اسے ایک ایسے سنگ دل بندے کے حوالے کردیا جو انہیں ہم سے ملنے تک نہیں دیتا...... جس نے آپی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے...... مجھے شادی کے نام سے ہی خوف آنے لگا ہے پھپھو۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟ شادی تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگی تو کیوں نا اس میں اپنے باپ کی خوشنودی شامل کرلو۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگی شادی لیکن ابھی نہیں پھپھو۔ ابھی...... میں کچھ کرنا چاہتی

ہوں...... کچھ بن کے دکھانا چاہتی ہوں......"

"بن کے دکھانا چاہتی ہو۔" پھپھو نے تلخ لہجے میں اس کی نقل اتاری۔ "ڈاکٹر بن رہی ہوتا...... انجینئر بن رہی ہوتا؟ کچھ شرم کرو نور، کبڈی کھیلنے والوں کی طرح دوڑتی پھر رہی ہو۔ ہمارے خاندان میں کس نے کیا ہے اس طرح کا کام؟ اس سے کیا حاصل ہونا ہے تم کو......؟"

"ہوسکتا ہے پھپھو کچھ ہو ہی جائے۔" نور نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

"کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔" پھپھو نے بھنا کر کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

وہ وہیں پر کافی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ مہرین نے اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

یہ پنجاب بھر کے کالجوں کے مقابلے تھے۔ نور اپنے کالج کی تمام برانچز کی طرف سے اس کیٹیگری میں سو میٹر ریس کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس کی دوست شاہینہ نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لینا تھا مگر مقابلوں سے صرف ایک ہفتہ پہلے شاہینہ فوڈ پوائزننگ کا شکار ہوگئی تھی اور ڈاکٹرز نے اسے تین ہفتے آرام کا مشورہ دے دیا تھا۔

یہ مقابلے نور کے لیے بڑے سود مند رہے۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی ہونہار ایتھلیٹ کے طور پر سامنے آئی۔ ان مقابلوں کے دوران میں ایک اور اہم بات ہوئی۔ اس کی ملاقات اسی دراز قد نوجوان سے بھی ہوگئی جس نے چند ہفتے پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی مدد کی تھی اور بدتمیزی کرنے والے اوباش لڑکوں کو سبق سکھایا تھا۔ وہ بڑا فلمی سا سین تھا اور اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ ابھی تک نور کے ذہن پر نقش تھا۔

مقابلوں کے دوران میں اپنی "ہیٹ" میں پہلا نمبر حاصل کرنے کے بعد نور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہانپ رہی تھی۔ میدان میں تالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ویل ڈن۔ مبارک ہو۔" ایک آواز سن کر وہ چونکی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے وہی کھڑا تھا۔ دراز قد، مضبوط شانے، چمکتی ہوئی پیشانی۔

"اوہ آپ یہاں؟" نور کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جی ہاں...... میرا نام فرہاد ہے۔ میں ویکلی سپر اسٹار میں اسپورٹس کے شعبے کا انچارج ہوں۔ یہ میرا کیمرا مین تنویر ہے۔"

"آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔" نور نے رسمی انداز میں کہا۔

"کیا ہم آپ کی ایک تصویر لے سکتے ہیں؟"

"نو...... آئی ایم سوری...... مجھے تصویر بنوانا پسند نہیں ہے۔" نور نے اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے...... کوئی بات نہیں۔" فرہاد نے خوشدلی سے کہا اور کیمرا مین کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گیا۔

"آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں مس نور؟" فرہاد نے کہا۔

"جی پوچھیے۔"

"یہاں کافی لڑکیاں حصہ لے رہی ہیں مگر آپ اپنے لباس اور رویے کے حوالے سے سب سے مختلف نظر آ رہی ہیں۔"

وہ مسکرائی۔ "میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ایک لڑکی مناسب اور باوقار لباس کے ساتھ بھی اکثر کھیلوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کرسکتی ہے۔"

فرہاد نے کہا۔ "بہت اچھی بات کہی ہے آپ نے...... لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کرے آپ آگے جائیں اور بڑے مقابلوں میں حصہ لیں۔ جب آپ اپر لیول پر پہنچتے ہیں تو پھر یہ لباس وغیرہ کے معاملے آڑے آتے ہیں۔"

"میں انشاء اللہ ایسے کسی معاملے کو آڑے نہیں آنے دوں گی۔ ثابت کروں گی کہ اگر ایک عورت میں صلاحیت ہے تو پھر اس طرح کی مجبوریاں اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔" وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنا اسکارف بھی درست کر رہی تھی۔ اس کا یہ انداز جیسے فرہاد کے دل کو بھا رہا تھا۔

اسی دوران میں نور کی استاد اور کوچ فرحانہ بیگ موقع پر پہنچ گئیں۔ نور کے تایا اور تایا زاد بھائی شرجیل بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے نور کو "ہیٹ" جیتنے پر مبارک باد دی اور اگلی ہیٹ کے لیے وش کیا۔ نور اپنی کوچ فرحانہ بیگ سے باتیں کرنے لگی۔ نور کے تایا خلیل بھی اب فرہاد رازی کو دیکھ چکے تھے۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملے اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ نور کی طرح تایا خلیل بھی فرہاد کے بہت شکر گزار تھے۔

فرہاد رازی بہت جلد بے تکلف ہوجانے والا نوجوان تھا۔ اس کی خوش گفتاری سے اخلاص اور انسیت جھلکتی تھی۔ فرہاد اور خلیل صاحب تماشائیوں کے درمیان آ بیٹھے۔ فرہاد نے خلیل صاحب کو بتایا کہ ایک والدہ کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ دو بڑے بھائی مستقل طور پر فرانس میں

شفٹ ہو چکے ہیں۔ وہ سیلف میڈ شخص تھا۔ اپنی کوشش سے ایک ہائی فائی میگزین میں ایک اچھی جاب تک پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ اسے فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے ایک چچا ماضی میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل چکے تھے۔ شاید وہ مزید آگے جاتے لیکن چوٹ لگنے کے باعث اس فیلڈ کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی کسمپرسی دیکھ کر فرہاد کو یہ خیال آیا تھا کہ ماضی کے ایسے باصلاحیت کھلاڑی جو اب گمنامی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے۔ آج کل وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست فیضان علی کے ساتھ مل کر اس پلان پر کام کر رہا تھا۔

جواب میں خلیل صاحب نے کہا۔ ”بھئی پھر تو ہم دونوں میں ایک قدر مشترک موجود ہے۔ میں نے بھی اپنے علاقے میں ایک فری کلینک قائم کیا ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں مستحق مریضوں کا حتی المقدور مفت علاج کیا جائے۔“

”اس سلسلے میں آپ کو کسی بھی طرح میرا تعاون درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔“ فرہاد نے کہا۔

خلیل صاحب نے کہا۔ ”تعاون کی صورت تو بالکل موجود ہے بھئی۔ تم نے اپنے ڈاکٹر دوست کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے دو ڈاکٹرز کا انتظام کر رکھا ہے لیکن کم از کم ایک ڈاکٹر کی ضرورت اور ہے۔ اگر تمہارے دوست اپنی سہولت کے مطابق کچھ وقت دے سکیں تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اگر وہ مناسب معاوضہ چاہیں گے تو وہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔“

”آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں انکل۔“ فرہاد نے محبت سے کہا۔ ”کسی نیک کام میں حصہ ڈالنے کا موقع ملنا تو ایک سعادت کی طرح ہوتا ہے۔“

کوئی دو گھنٹے بعد نور کی دوسری ہیٹ ہوئی۔ یہ ہیٹ بھی اس نے ایک سخت مقابلے کے بعد جیت لی۔ یہ بڑی اہم کامیابی تھی، سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ تماشائیوں میں صرف فیملیز کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ بڑا اچھا ماحول تھا، نور کی کلاس فیلوز نے نور کی اس کامیابی کو بڑی اچھی طرح ”سیلیبریٹ“ کیا۔ اب فائنل ہیٹ تھی، اس میں پنجاب کے انٹر کالجیٹ مقابلوں کی تیز رفتار ترین لڑکی کا انتخاب ہونا تھا......نور کے اچھے چانسز موجود تھے۔

دوسری ہیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد جب نور انکلوژر میں پہنچی تو تایا خلیل اور فرہاد پرانے شناساؤں کی طرح بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ تایا خلیل، فرہاد کو مدعو کر چکے تھے کہ وہ ان کے گھر آئے اور گھر کے بالکل پاس ہی واقع ان کے فری کلینک اور ڈسپنسری کا معائنہ کرے۔

اگلے روز کا فائنل مقابلہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ نور یہ مقابلہ جیت تو نہیں سکی مگر اس نے تیسری پوزیشن حاصل کر لی اور وکٹری اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ اس نے کانسی کا تمغا جیتا۔ یہ کامیابی بھی معمولی نہیں تھی۔ تایا خلیل نے اسے گلے سے لگایا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ ”مجھے اپنے اللہ سے پوری امید ہے، ایک دن تم کوئی بڑی کامیابی حاصل کر کے اس نامعقول کا منہ بند کر دو گی۔“ نامعقول کا لفظ وہ اکثر و بیشتر اپنے چھوٹے بھائی اشفاق کے لیے ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ اشفاق جن کو عام لوگ مولوی اشفاق مہرا کہتے تھے اور جن کا کتابوں کا کاروبار آہستہ آہستہ جم رہا تھا۔

انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد نور کا اکثر فرہاد سے آمنا سامنا ہونے لگا۔ فرہاد اور اس کا دوست ڈاکٹر فیضان، تایا جان کے فری کلینک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ فرہاد اکثر گھر بھی آجاتا تھا۔ شرجیل اور عثمان سے بھی اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں نور کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دل کی گہرائی میں کسی گوشے کے اندر فرہاد کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کیفیت شاید یک طرفہ نہیں تھی۔ اس نے بھی اکثر فرہاد کی گہری آنکھوں میں اپنے لیے ایک بے نام سا عکس لرزاں دیکھا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی، اس کے دور شباب کے کچھ تقاضے تھے مگر وہ ان معاملوں سے کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے مہربان اور محسن تایا کے لیے کسی بھی درجے کی معمولی سے معمولی پریشانی کا باعث بنے۔ وہ اپنے حوالے سے انہیں ہمیشہ سربلند اور سرخرو دیکھنے کی خواہش مند تھی...... اور اس کے لیے اپنے جسم اور جان پر ہزار ہا صدمے سہنے کے لیے تیار تھی۔

ایک روز بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ تایا ابا گھر میں ہی تھے۔ فرہاد بھی آیا ہوا تھا اور ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ نور کو ٹریننگ سینٹر جانا تھا۔ بڑے تایا زاد بھائی شرجیل کو کوئی کام تھا اور وہ گاڑی لے کر گیا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر تایا ابا یا عثمان اسے موٹر بائیک پر لے جاتے تھے۔ آج بھی یہی پروگرام تھا مگر پھر بارش شروع ہو گئی۔

”تایا ابا! مجھے دیر ہو جائے گی۔ آج میرا جانا بہت ضروری ہے۔“ نور نے ڈرائنگ روم میں جا کر اور ذرا ٹھنک کر کہا۔

بادل گرج رہے تھے اور بارش برسنا شروع ہو گئی تھی۔ تایا ابا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ”ایسا کرو تم فرہاد

بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ یہ تمہیں چھوڑتا ہوا نکل جائے گا، واپسی پر شرجیل لے آئے گا۔"

"لیکن تایا ابا......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا جی! میں کہہ رہا ہوں نا کہ چلی جاؤ۔" تایا ابا نے اعتماد سے کہا۔ فرہاد کے پاس چھوٹی سوزوکی مہران تھی۔ وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ہلکی بارش ہو رہی تھی لیکن پھر سہ پہر میں ہی اندھیرا چھا گیا اور تابڑ توڑ مینہ برسنے لگا۔ یہ جولائی کا وسط تھا اور مون سون کی دوسری بارش تھی۔ انہیں ریواز گارڈن سے قذافی اسٹیڈیم کی طرف جانا تھا۔ ابھی وہ نہر والی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں شدید ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑا ہورڈنگ سڑک پر گر گیا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہے اور گاڑیاں آمنے سامنے سر جوڑے کھڑی ہیں۔ ایسے شدید موسم میں عام طور پر ٹریفک پولیس بھی دائیں بائیں ہو جاتی ہے اور پھنسی ہوئی سیکڑوں گاڑیاں قدرت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ گاڑی موڑ لی جائے۔" فرہاد نے کہا۔

"ہاں، وہ دیکھیں اور لوگ بھی مڑ رہے ہیں۔" نور نے تائید کی۔

فرہاد نے پھرتی سے گاڑی موڑ لی۔ اب انہیں ایک لمبا چکر کاٹ کر کینال روڈ پر پہنچنا تھا مگر وہ دو تین سو میٹر دور ہی گئے ہوں گے کہ یہاں بھی ٹریفک جام ملا۔ فرہاد نے بہتر سمجھا کہ گاڑی ریس کورس پارک کی پارکنگ میں لے جائے۔

انہوں نے گاڑی پارکنگ میں روک دی اور سڑک کی صورتِ حال بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش اتنی تابڑ توڑ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اردگرد کے راستوں پر کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ اب اگر ٹریفک کھل بھی جاتا تو وہ اتنی جلدی یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

"یہ تو اچھا نہیں ہوا۔" نور بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "میڈم فرحانہ سینٹر میں پریشان ہوں گی۔ ادھر تایا جان کو گھر میں فکر ہو گی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں نور، وہ سامنے پی سی او نظر آ رہا ہے۔ میں انکل خلیل کو فون کر دیتا ہوں۔"

"ابھی ٹھہر جائیں، بارش تیز ہے۔" نور نے کہا۔

آدھ پون گھنٹا مزید گزر گیا۔ بارش کچھ دیر کے لیے ہلکی ہو کر پھر تیز ہو جاتی تھی۔ سیوریج کے نظام میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے اردگرد کی سڑکوں پر پانی کی سطح بلند ہوتی جا رہی تھی۔ آخر نور کے منع کرنے کے باوجود فرہاد نے اپنی جینز گھٹنوں تک اڑسی اور فون کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی اور نور کو تشویش لاحق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی مگر تھی تو لڑکی ہی۔ آخر فرہاد واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جو اس نے شاپر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

"ہو گیا فون؟" نور نے پوچھا۔

"بالکل ہو گیا۔ انکل نے ہی اٹھایا تھا، پریشان تھے۔ انہوں نے سینٹر میں فون کیا تو وہاں سے میڈم فرحانہ نے انہیں بتایا کہ نور نہیں پہنچی۔"

"مجھے بھی پریشانی تھی۔"

"نہیں۔ میں نے انہیں پوری تسلی دے دی ہے اور کہا ہے کہ وہ میڈم کو بھی آگاہ کر دیں۔"

اس طرف سے پریشانی ختم ہوئی تو نور نے شاید پہلی بار اردگرد کے موسم کی نیرنگی پر دھیان دیا۔ دور تک ریس کورس پارک کے خوب صورت سبزہ زار نظر آ رہے تھے۔ ان میں درخت تھے اور پھولوں کے تختے تھے...... اور روشیں تھیں۔ یہ سب کچھ تسلسل کے ساتھ مون سون کی اس دھواں دھار بارش میں بھیگ رہا تھا۔

"یہ لیں جی! کے ایف سی کے برگر۔ مجھے پتا تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔" فرہاد نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے؟"

"اگر میں کہہ بھی دوں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔ آپ ہر وقت جسمانی مشقت کی صورتِ حال میں رہتی ہیں۔ عام لوگوں کی نسبت آپ کو انرجی کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"تو پھر عام لوگ اپنے لیے برگر کیوں لے آئے ہیں؟" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔" وہ اپنے بھیگے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔

اس نے ایک برگر نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور نے ابھی دو بائٹ ہی لیے تھے کہ وہ پکارا: "ٹھہریے ٹھہریے محترمہ! آپ کا زنگر تو یہ رہا۔ یہ میرا اولیٹو برگر ہے۔" اس نے نور والا برگر اس سے لے کر دوسرا تھما دیا۔

زنگر واقعی نور کو پسند تھا مگر فرہاد کی اس حرکت میں تھوڑی سی شوخی اور چالاکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ

کر ''برگر'' نور کو تھما دیا تھا۔ اب وہ اس کے چھوٹے برگر کو بڑے اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا۔ یہ ایک معنی خیز اشارہ تھا۔ نور کے سارے جسم میں جیسے سنسنی اور انبساط کی ایک لہر سی دوڑی۔

اس نے بائٹ لیتے ہوئے کن انکھیوں سے فرہاد کی طرف دیکھا۔ وہ یوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ دلکش شخصیت کا مالک تھا اور یہ دلکش شخصیت دن بدن اس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔

کولڈ ڈرنک کا سپ لے کر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''یہ راستے بھی کیا چیز ہوتے ہیں نور! اپنوں کو غیر اور غیروں کو اپنا بنا دیتے ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر اس روز میں خلافِ معمول اس سڑک سے گزر کر آفس نہ جا رہا ہوتا تو آپ سے اور انکل سے کبھی ملاقات نہ ہو پاتی۔''

''ہاں، راستے کیا چیز ہوتے ہیں اور یہ بارش بھی کیا چیز ہوتی ہے...... دو اچھے بھلے بندوں کو ایک گاڑی میں بند کر کے، فلسفیوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' وہ بولی۔

''تو میں آپ کو فلسفی لگ رہا ہوں؟''

''باتیں تو ایسی ہی کر رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔''

''ویسے برا نہ مانیے گا۔ یہ بڑا گھسا پٹا فقرہ ہے۔''

''الفاظ اہم نہیں ہوتے محترمہ، ان کا مفہوم اور ان کی تاثیر اہم ہوتی ہے۔''

اچانک سامنے آسمان پر بجلی کا نہایت زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ نور نے بے ساختہ فرہاد کا بازو تھام لیا۔ اس کی انگلیاں جیسے اس کے سڈول بازو میں کھب سی گئی تھیں۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ ہٹا بھی لیا۔ بارش کی بوچھاڑیں تیز ہوگئیں۔

فرہاد نے کہا۔ ''آپ بہادر لڑکی ہیں۔ چھوٹی موٹی لڑکیوں سے بہت مختلف لیکن ہیں تو لڑکی۔'' اس کا اشارہ یقیناً اس گرفت کی جانب تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نور نے اس کے بازو پر بنائی تھی۔

وہ اپنے نیلے اسکارف کو درست کرتے ہوئے بولی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر آپ تھوڑی سی ''مزید لڑکی'' ہوتیں۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''فلموں ڈراموں میں تو لڑکیاں ایسے موقعوں پر ڈر کر قریبی مرد حضرات کے اوپر ہی گر جاتی ہیں۔''

''آپ کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہے۔'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''سس......سوری۔''

وہ ذرا توقف سے گویا ہوئی۔ ''میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر پانی کافی کم ہوگیا ہے۔''

فرہاد نے ٹھنڈی سانس لی۔ پانی واقعی ایک دم کم ہونا شروع ہوگیا تھا حالانکہ بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فرہاد کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اتنے خوب صورت موقع کو یونہی بغیر ''پیش رفت'' کے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ کبھی سڑک کو دیکھ رہا تھا، کبھی آسمان کو۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' نور نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا...... اس کی خوب صورت آنکھوں میں پھر ہلکی سی شوخی عود کر آئی۔ ''او کے۔'' اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ تین چار بار سیلف لگایا لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ ''ہوجا...... ہوجا۔ میری جان کی دشمن ہوجا......'' وہ بڑبڑایا۔

پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے نور صاحبہ! گاڑی ہم سے متفق نہیں۔ وہ اس موسم سے تھوڑا سا اور لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔''

''کچھ لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ سمجھ دار سمجھتے ہیں...... مثلاً، ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس وہی جانتے ہیں کہ گاڑیوں میں چور سوئچ بھی ہوتے ہیں۔''

''آپ کا خیال ہے میں نے چور سوئچ دبایا ہے؟''

''میرا خیال یہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ حرکت فرمائی ہے۔''

''اوہ گاڈ...... تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں۔''

فرہاد نے بے بسی کی اداکاری کی اور جھکے ہوئے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسے برا نہ مانیے گا۔ کیا آپ کا بھی کوئی چور سوئچ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے؟''

''یہ کیا سوال ہوا۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''دراصل، مجھے لگتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے جس کے سبب آپ نے اپنی خاص قسم کی دھڑکنوں کو بند کیا ہوا ہے...... پلیز، اس سوئچ کو آف کریں۔ دل کو دھڑکنے دیں، آزادی سے...... جب وہ دھڑکے گا تو زندگی کی رگوں میں خون خود ہی اپنے راستے تلاش کرنا شروع کردے گا۔''

"مجھے شاید نئے راستوں کی ضرورت نہیں۔ میں جس راستے پر چل رہی ہوں، وہی میرے لیے کافی ہے۔"

"دیکھا نا۔ ہے چور سوچ۔ بالکل ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

اس کے انداز نے نور کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ "اچھا اب چلیں۔ ابھی اندھیرا ہو جائے گا۔"

"لیکن...... آپ نے یہ سوئچ آف کرنے والا کام ضرور کرنا ہے۔ پلیز...... پلیز۔"

وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی پھر اسے لگا کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی طرح ہے۔ اس نے گھبرا کر کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

"تھینک یو...... تھینک یو۔" فرہاد نے کہا اور نیچے جھک کر گاڑی کا چور سوئچ دبا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ پارکنگ سے باہر نکلتے ہی وہ چوراہے پر پہنچ گئے۔ ٹریفک سگنل بند تھا، انہیں رکنا پڑا۔ دفعتاً نور کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر بائیں جانب کھڑی ایک ایف ایکس گاڑی پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا کرخت شکل اور چھوٹی ڈاڑھی والا جو نوجوان بیٹھا تھا، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اسے پہچان سکتی تھی، یہ وہی تھا...... ہاں، یہ وہی تھا۔ پھپھو اور بسمہ نے اس کا نام... ذوالقرنین بتایا تھا۔ یہی تھا جسے اباجی نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ بھی بڑے دھیان سے نور ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نور نے گھبرا کر اسکارف کو اپنی ٹھوڑی سے اوپر کھینچ لیا اور اپنا ایک تہائی چہرہ چھپا لیا۔ فرہاد نے اس وقت کوئی مزاحیہ بات کی تھی اور ہنس رہا تھا۔ نور کو اس کی بات کی سمجھ آئی تھی اور نہ اس کی ہنسی کی، اس کے اندر تو جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے ایف ایکس پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً وہ مولانا حبیب کا بیٹا قاری ذوالقرنین تھا اور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران میں فرہاد نے بھی نور کی بے چینی کو نوٹ کر لیا۔ وہ بولا۔ "کیا بات ہے نور...... آپ کچھ پریشان ہو گئی ہیں؟"

"نہیں، پریشان تو نہیں۔" اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

اسی دوران میں سگنل سبز ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ فرہاد آگے نکل گیا۔ ذوالقرنین غالباً آخر تک نور کو دیکھتا رہا تھا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جا کر نور نے سائڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نیلے رنگ کی ایف ایکس اب بھی ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ نور کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔

اب ایف اے ایس کا ٹائم تو گزر چکا تھا، اس لیے نور واپس گھر ہی جا رہی تھی۔ مزنگ چورنگی کے چوراہے پر نور نے ایک بار پھر عقب نما میں جھانکا، نیلی گاڑی عقب میں موجود تھی مگر پھر آگے جا کر وہ نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

رات کو نور دیر تک جاگتی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ ذوالقرنین نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، وہ شکوک و شبہات سے اٹی ہوئی تھیں۔ کیا وہ اس بارے میں کسی کو آگاہ کرے گا؟ کہیں وہ یہ بات نور کے گھر اور اس کے اباجی تک تو نہیں پہنچا دے گا؟ اور اگر ایسا ہوا تو اباجی جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، ان کا ردعمل کیا ہو گا؟

اس نے سوچا کہ کیا وہ اس حوالے سے پیش بندی کرے اور پہلے ہی تایاجی اور تائی جی کو بتا دے؟

اگلے روز وہ قریبی مارکیٹ میں گئی اور وہاں سے بسمہ کی ایک دوست کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ بسمہ پی سی او سے تایا کے فون پر رابطہ کرے یا خود گھر آ کر اس سے ملے۔ شام سے کچھ دیر پہلے گھر کے فون پر بسمہ کی کال آ گئی۔ نور نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "بسمہ! گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟"

"بس اسی طرح کی خیریت ہے جس طرح کی چل رہی تھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نن...... نہیں...... مگر مجھے پریشانی تھی۔ انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد میری ایک تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی۔ اباجی کی نظر سے تو نہیں گزری؟" نور نے بات بتائی۔

"گزری بھی ہو گی تو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ آج کل بالکل گم صم سے ہیں نور! آپی بتول کی طرف سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔ بھائی غیاث کا رویہ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اتوار کو بڑے ماموں مراد ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپی سیڑھیوں سے گری ہے۔ ماتھے اور کلائی پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ گری ہیں یا کچھ اور ہوا ہے۔"

نور کے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔ اپنے بہنوئی غیاث کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور شاید اچھا ہی کرتا تھا کیونکہ اس کے منہ سے اکثر پتھر ہی جھڑتے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب کبھی بھی اس کے

تصور میں اپنے بہنوئی غیاث کی سخت گیری یا اپنی مرحومہ ماں کی بے بسی آتی تھی، اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہوجاتی تھی۔ اس کے پاؤں جیسے بے ساختہ حرکت کرنے لگتے تھے۔ اس کے سینے میں ترنگ سی جاگنے لگتی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن، کچھ کر دکھانے کی تڑپ، مرد کے تسلط سے آزادی کی آرزو۔

پانچ چھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس روز والے واقعے کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ نور اب سوچنے لگی کہ شاید وہ ذوالقرنین تھا ہی نہیں۔ اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے یا شاید اسکارف کی وجہ سے وہ اسے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نور کو پہچان تو لیا ہو مگر فرہاد کو اس کا تایازاد بھائی یا ماموں سمجھا ہو۔

☆☆☆

ذوالقرنین نماز روزے کا پابند ایک پرہیزگار نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ والد مولانا حبیب اللہ ایک جانے پہچانے عالم دین تھے لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو بچوں کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔ زندگی کے ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اسی طرح شباب کے بھی۔

ذوالقرنین ان نوجوانوں میں سے تھا جو کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اسے بالغ ہوئے سات برس ہونے والے تھے اور اس کے جسمانی تقاضے شاید اس سے بھی پہلے کے تھے پھر ایک روز اس نے ماں سے کہہ ہی دیا تھا......

"امی! میرے لیے کوئی ڈھونڈیں......"

اس واقعے کے کوئی دو ماہ بعد اس نے ایک شادی میں پہلی بار مولوی اشفاق صاحب کی دختر عین النور کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی مکمل عبایا میں تھی۔ ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ نے اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ذوالقرنین! وہ کریم کلر عبایا والی ہے جس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔"

اس کے بعد شادی کی پوری تقریب میں ذوالقرنین کی نگاہوں میں اس کا من موہنا چہرہ گھومتا رہا تھا۔ بعدازاں اسے ایک دن عین النور کی ایک تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ اس کے دل کو یہ لڑکی ہر طرح سے بھائی تھی۔ اس نے کئی شب و روز اس کی سوچ میں گم گزار دیے تھے۔ اس نے آنے والے خوشگوار دنوں کی چاپیں سنی تھیں اور دھڑکنوں کو بے ترتیب محسوس کیا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آیا تھا جب یہ معاملہ فائنل ہونے جا رہا تھا...... اور تب سب کچھ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات جہاں تک پہنچی تھی وہیں پر ختم ہوگئی تھی......

اور کچھ دنوں بعد یہ اڑتی اڑتی سی بات دل گرفتہ ذوالقرنین کے کانوں تک پہنچی تھی کہ لڑکی اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر تایا کے گھر میں رہنے لگی ہے اور کھیلوں وغیرہ میں حصہ لے رہی ہے...... چار دن پہلے ذوالقرنین نے مولوی اشفاق کی بیٹی عین النور کو پھر دیکھا تھا اور اس مرتبہ کسی شادی کی تقریب میں نہیں بلکہ بارش کی رم جھم میں ریس کورس پارک کے سامنے ایک گاڑی کے اندر۔ وہ ایک خوبرو نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور ذوالقرنین کی طرف دیکھ کر بے طرح ٹھٹک گئی تھی۔ تب سے ذوالقرنین کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکی کچھ غلط سلط چکروں میں پھنس چکی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ اپنی بہن خدیجہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرے...... لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ ایک بار خود اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے یہ کھوج بھی لگا لیا تھا کہ نور اس روز جس خوبرو لڑکے کے ساتھ دیکھی گئی تھی، اس کا نام فرہاد رازی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کے ہفت روزہ میگزین میں کام کرتا ہے اور آج کل نور کے تایا خلیل مہرا صاحب کے گھر میں اس کا بہت آنا جانا ہے۔ یہ معلومات اس نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے حاصل کی تھیں۔ یہ دونوں دوست ایک مقامی تنظیم اصلاحِ معاشرہ کے کارکن تھے۔ کچھ عرصے سے ذوالقرنین بھی اسی تنظیم کا کارکن تھا۔

☆☆☆

نور ٹریننگ سینٹر ایف اے ایس میں موجود تھی اور اسٹریچنگ کی ورزشیں کر رہی تھی۔ کوچ میڈم فرحانہ کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں دیگر لڑکیوں کو انسٹرکشن وغیرہ دینا بھی نور کی ذمے داری تھی۔ اتنے میں چوکیدار زمان خان نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ "بی بی صیب! ایک بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت دیر سے ضد کر رہا ہے۔ اپنا نام ذوالقرنین بتا رہا ہے۔"

نور کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ اس نے پونی ٹیل کس کر باندھی۔ اپر پہنا پھر اسکارف لیا اور باہر پہنچی۔ وہ میڈم فرحانہ کے آفس میں بیٹھا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا اور "السلام علیکم" کہا۔

"جی فرمائیے۔" نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"اہم بات ہے۔ کیا آپ مجھے بیٹھنے کا نہیں کہیں گی؟"

پہلے تو نور کے جی میں آئی کہ نفی میں جواب دے پھر اس نے خود کو سنبھالا اور میڈم کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی کہنا ہے چند لفظوں میں کہہ دیں۔"

"چند لفظوں میں کہنے والی بات ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔" وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "آپ کو تسلی سے سننا ہوگا۔ ورنہ میں کسی اور وقت آجاؤں گا۔"

"آپ کوئی بہت بڑا انکشاف نہیں فرمانے والے، آپ نے مجھے گاڑی میں تایا جان کے دوست کے ساتھ دیکھا ہے اور اب اسی سلسلے میں کوئی بے کار بات ارشاد کرنے والے ہیں۔"

"میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ آپ گمراہی کی طرف جارہی ہیں۔ آپ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کے والد مولوی اشفاق ایک عزت دار آدمی ہیں۔ آپ کیوں ان کو رسوا کرنا چاہ رہی ہو؟" وہ نور کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔

"دیکھو مسٹر اتم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم خوامخواہ ٹھیکیدار بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"اگر تمہیں اپنے اچھے برے کی تمیز ہوتی تو اپنے محسن اور اپنے بدخواہ کو پہچانتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔"

"بلیک میل کر رہے ہو؟ ٹھیک ہے بتادو جس کو بتانا ہے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے......"

"اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم ایک نہیں کئی غلط کام کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ نہ بھی ہو تو انسانیت کے طور پر میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ یہ پتلونیں کس کے چھلانگیں مارنا، فٹ بال اور جوڈو کراٹے کھیلنا، کیا یہ لڑکیوں اور عورتوں کے کام ہیں؟ قدرت نے عورت کو صنفِ نازک بنایا ہے، اس کی کچھ اور ذمے داریاں ہیں، اس کی محنت مشقت کے کچھ اور میدان ہیں۔"

"ہاں کچن میں برتن دھونا، ڈھیروں کپڑے استری کرنا، سستے بازاروں میں جا کر بچوں کے لیے شاپنگ کرنا...... یہ ہیں اس کے میدان...... تم جیسے لوگ ہیں مسٹر ذوالقرنین! جنھوں نے اسلامی دنیا کی نصف آبادی کو مُردار بنا کر رکھ دیا ہے، اپنی یہ تقریر تم اپنے پاس رکھو تو بہت بہتر ہے۔"

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

ذوالقرنین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

وہ واپس ہال کمرے میں جا کر بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بندہ جا چکا ہے۔

تین چار دن پھر تناؤ میں گزرے۔ نور کو اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ردعمل ظاہر ہو۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ اب کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔ کسی اور سے، اس کی مراد نور کے ابا جان کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟

بہرطور خیریت ہی گزری۔ نور اب فرہاد کے سلسلے میں زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ وہ دو تین بار گھر بھی آیا مگر نور نے اس کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ حسبِ معمول اسے کالج چھوڑنے اور واپس لانے کے لیے ماموں مراد کی ڈیوٹی تھی۔ ایف اے ایس کی آمدورفت تایا ابا کے ذمے تھی۔ تایا اب اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے تھے اور شب و روز اس کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے۔ وہ تہجد بھی پڑھتے تھے۔ ایک رات نور کھانسی کی دوا لینے کے لیے اٹھی تو اس نے چار بجے کے لگ بھگ تایا ابا کو مصلے پر بیٹھے اور اشک بار آنکھوں سے دعا مانگتے دیکھا۔ نور کو دیکھ کر انہوں نے دعا ختم کی اور اس سے اٹھنے کی وجہ پوچھی تو نور نے بتایا کہ یونہی رات کے کھانے میں دہی پکوڑیاں کھالی تھیں جس کی وجہ سے کھانسی ہو رہی ہے۔

وہ مضطرب ہو گئے۔ "اگر زیادہ مسئلہ ہے نور تو ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ تمہیں اس طرح کی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے۔ سالانہ ایونٹ میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہیں ہر طرح فٹ ہونا چاہیے۔"

اس نے تایا ابا کو تسلی دی اور بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

وہ بالکل ٹھیک تھی...... لیکن شاید بالکل ٹھیک نہیں بھی تھی۔ وہ فرہاد سے مکمل گریز کر رہی تھی مگر اس گریز میں شاید اس کا دل اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک دن دور سے فرہاد کا ستا ہوا چہرہ دیکھا تھا اور اس کے سینے میں ایک درد سا لہریں لینے لگا تھا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں خود ہی سے پوچھا...... "کیا تم فرہاد کو چاہنے لگی ہو؟"

جواب نفی میں نہیں تھا۔ اسے ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ ان راستوں پر چلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے کھیل پر مرکوز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے ایسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی لغزش بھی نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے تایا ابا کو ابا جان کے سامنے یا دیگر لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے اندر ایک

جنگ سی رہنے لگی۔ وہ ٹریننگ میں بھرپور حصہ لے رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت اس کے تصور میں فرہاد کا ستا ہوا اداس چہرہ بھی آ جاتا تھا۔

ایک دوپہر جب گھر میں سب سو رہے تھے، فون کی بیل ہوئی۔ نور نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فرہاد تھا۔ نور کی آواز پہچان کر وہ فوراً بولا۔ ”پلیز نور! فون بند نہ کرنا۔ میں آپ سے بس ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتا ہوں۔“

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔ ”کہیے میں سن رہی ہوں۔“

”نور! مجھے لگتا ہے کہ اس روز میں نے گاڑی میں آپ سے جو بے تکلف باتیں کیں، وہ آپ کو بری لگی ہیں۔“

”بری نہیں لگیں تو اچھی بھی نہیں لگیں۔“ اس نے مبہم جواب دیا۔

”میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں..... اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

”چلیں، آپ وعدہ کرتے ہیں تو اچھی بات ہے۔“

”لیکن صرف ایک درخواست ہے میری۔“

”فرمائیں۔“

”صرف ایک بار..... آپ سے دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن فون پر نہیں آپ کے سامنے بیٹھ کر۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے ابھی جو وعدہ کیا ہے وہ آغاز ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔“

”نہیں نور! یقین کریں میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے۔ اپنی وجہ سے میں آپ کے ماتھے پر ایک چھوٹی سی شکن دیکھنا بھی نہیں چاہوں گا۔ مجھے آپ کے صرف دس پندرہ منٹ درکار ہیں، جہاں بھی آپ کہیں۔“

نور صاف انکار کر دینا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں کیوں نہ کر سکی۔ کچھ فرہاد کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ وہ اسے سخت جواب نہ دے سکی۔

تایا جان فرنیچر کا کام کر رہے تھے۔ وہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں چنیوٹ جاتے تھے اور پھر گجرات کا چکر لگاتے ہوئے اگلے روز واپس آتے تھے۔ دو روز بعد وہ جانے والے تھے، ان کی غیر موجودگی میں گاڑی بھی ان کے پاس ہی ہوتی تھی، ایک دن کے لیے نور کو رکشا پر ایف اے ایس جانا پڑتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ رکشا پر گئی اور گلبرگ مارکیٹ کی ایک کیفے شاپ میں اس نے آدھ پون گھنٹے کے لیے فرہاد سے بات چیت کی۔ اس نے چادر کا نقاب کیا ہوا تھا اور آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ فرہاد نے بڑے سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں نور کی سماعت تک اپنے دل کی بات پہنچائی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا اس کے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ نور کا جواب بھی حوصلہ شکنی والا نہیں تھا۔ تاہم اس نے دو باتیں فرہاد پر بالکل واضح کر دیں۔ اس نے کہا کہ اس کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ اس کے بڑوں نے کرنا ہے اور وہ ان کے اس حق میں ایک ذرا سی کمی بیشی کی بھی متحمل نہیں ہے..... کیونکہ وہ پہلے ہی اس حق کے حوالے سے بہت شرمندہ ہے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ فی الحال اس کی ساری کی ساری توجہ اپنے کیرئیر کی طرف ہے، اس کے تایا ابا نے جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا ہے، وہ اسے پورا کرنا چاہتی ہے..... جب وہ اس مرحلے سے نکل جائے گی تو پھر شادی وغیرہ کا معاملہ زیر غور آئے گا۔ تب تک وہ فرہاد سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ہاں ان کے دلوں میں جو کچھ موجود ہے، وہ موجود رہے گا اور وہ اس حوالے سے دعا گو رہیں گے۔

یہ دوسری شرط کافی کڑی تھی۔ فرہاد نے بصد منت و سماجت نور سے اتنی سی رعایت لے لی کہ مہینے میں فقط ایک بار وہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے بات کر لیا کریں گے اور وہ بھی فون پر۔

وہ بے حد خوش گفتار تھا۔ اس کی باتوں میں محبت اور لطافت کی ایسی چاشنی تھی کہ نور اس کے پاس سے اٹھ نہیں پارہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”نور! میں نے آپ کو پہلی بار شادی کے فنکشن میں دیکھا تھا، آپ نے بڑے کلرفل کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ آپ کو بالکل سادہ لباس میں دیکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو ایک بار پھر رنگین لباس میں دیکھوں۔ لگتا ہے کہ اگلے ہفتے شاید میری یہ مراد پوری ہو جائے۔“

”کیا مطلب؟“ نور نے اپنی لمبی پلکیں جھپکیں۔

”آپ کے کالج میں گیٹ ٹوگیدر ہے، چھوٹے موٹے کھیل بھی ہوں گے۔ مجھے رسالے کی طرف سے کوریج کے لیے آنا ہے.....“

بننا سنورنا نور کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ لڑکپن میں جب وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتی تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔ ایسا عموماً شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی ہوتا تھا..... اور اس وقت تو نور کی باقاعدہ ہنسی چھوٹ جاتی تھی جب وہ دیکھتی کہ ابا جان کے ڈر سے ان کا سارا بناؤ

سنگھار بھاری اوڑھنیوں کے نیچے چھپ گیا ہے اور وہ زرق برق کپڑے پہن کر جس طرح لپٹی لپٹائی ہوئی ،تقریب میں گئی تھیں اسی طرح واپس آ گئی ہیں۔

لیکن آج وہ خود کو بناؤ سنگھار کے لیے تھوڑا سا مجبور پا رہی تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط سے ہی کام لیا۔ ہلکی سی لپ اسٹک، تھوڑا سا پف پاؤڈر اور بائیں کلائی میں چند چوڑیاں، لباس بھی زیادہ شوخ نہیں تھا۔ کالج کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں میلے کا سماں تھا، بے شمار اسٹالز اور تفریح کے لوازمات تھے۔ اس کی کولیگ شاہینہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی آج کل پوری تندہی سے صوبائی سطح کے مقابلوں کی تیاری کر رہی تھی۔

فرہاد اور چند دیگر اخباری نمائندے اس تقریب میں چکرا رہے تھے۔ فرہاد کے ساتھ ایک خاتون فوٹوگرافر تھی۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا نور تک آ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد بولا۔ ''آپ کو رنگین لباس میں دیکھنے کی خواہش تو کسی حد تک پوری ہوئی...... مگر...... یہ جو چلمن ہے دشمن ہے ہماری۔''

''اور یہ ہمیشہ دشمن ہی رہے گی۔'' نور نے مستحکم لہجے میں کہا۔ (چلمن سے فرہاد کی مراد، نور کا اسکارف تھا)۔

''چلیں، کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی شکر کا مقام ہے۔'' فرہاد نے نور کے سراپا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

نور کو اپنے رخساروں پر شرم کی تمتماہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔ ''اب اگر آپ کسی اور طرف تشریف لے جائیں تو بہتر نہیں؟''

''اور کہاں جائیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

''جی ہاں، الو کو بھی اجالے میں کچھ نظر نہیں آتا۔'' نور نے کہا اور ایک دوست کو پکارتی ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شاہینہ بھی وہاں آ گئی۔ وہاں مٹکا ریس اور بوری ریس ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکیوں نے نور اور شاہینہ سے کہا کہ وہ بھی ان ریسوں میں حصہ لیں۔

میڈم فرحانہ نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی یہ دونوں تو اب اپر لیول کی رنرز ہیں۔ یہ ان دوڑوں میں حصہ لیں گی، تو دوسری لڑکیوں کا حق مارا جائے گا۔''

وہ دونوں ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور یہ مقابلے دیکھنے لگیں۔ شاہینہ ذرا چبھتی ہوئی سی نگاہوں سے نور کو دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ''یہ لڑکا تمہارے ارد گرد کیوں گھوم رہا تھا؟'' اس کا اشارہ فرہاد کی طرف ہی تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں...... یونہی انٹرویو کا ماحول بنا رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔''

شاہینہ اب بھی تیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''دیکھو نور! ہمارا آپس میں کچھ ٹینشن ہے لیکن ہم دوست بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بھلائی چاہتی ہیں۔ ہمیں اس طرح کے معاملوں سے دور رہنا چاہیے۔''

''کس طرح کے معاملوں سے؟'' نور نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ یہ سب لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں کھینچ کر سیڑھی سے گرا دینے والے، ہمیں اس وقت سارا دھیان اپنے گیم پر رکھنا چاہیے۔ گوجرانوالہ کی نشو کی ٹائمنگ بڑی اچھی جا رہی ہے۔ ویسے بھی ایک کھلاڑی خاندان سے ہے وہ۔ فزیکلی بڑی فٹ ہے۔ ہم ذرا ڈھیلی پڑیں گی تو وہ ''لیڈ'' لے جائے گی۔''

''پتا نہیں تم نے اپنے ذہن میں کیا بنا لیا ہے۔ وہ تو بس بات کر رہا تھا مجھ سے......''

''ساری بات...... بات کرنے سے ہی شروع ہوتی ہے پھر بات گلے پڑ جاتی ہے۔ ذرا سنبھل کر رہو۔ ویسے بھی تم نے ایک بہت بڑا چیلنج قبول کیا ہوا ہے۔ والد کو ناراض کر رکھا ہے اور انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ ایسا ہو جائے جو ان کو مزید خفا کر دے۔''

شاہینہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ اندر سے کانپ سی گئی۔ بہر حال اس نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''اس بارے میں تم بے فکر رہو ڈیئر! باقی جہاں تک نشو کی بات ہے۔ اس کا غرور تو ہم دونوں میں سے کسی ایک نے توڑ ہی دینا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کافی منہ پھٹ بھی ہے، میڈم کے بارے میں کچھ الٹی سیدھی باتیں بھی کی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایف اے ایس کی آڑ میں مال بنا رہی ہے......''

ابھی نور اور شاہینہ میں بات ہو ہی رہی تھی کہ ان کے عقب میں کچھ لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ وہ گوجرانوالہ سے آئی تھیں اور نشو عرف نشو بجلی کی سپورٹرز تھیں۔ ان میں سے دو تین نے نشو کی تصویر والے پوسٹر بھی اٹھا رکھے تھے اور سالانہ مقابلوں میں نشو کو فیورٹ قرار دے رہی تھیں۔ انہوں نے شاہینہ اور نور پر آوازے کسے۔ خاص طور سے نور کو نشانہ بنایا اور اسے نور چپنڈو قرار دیا۔

نور کی حمایت کرنے والی لڑکیوں کے ایک گروہ نے اس ہوٹنگ کا بھرپور جواب دیا۔ جھگڑے کی صورتِ حال

پیدا ہوگئی۔ منتظمین نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔
نور نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ٹریننگ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سالانہ صوبائی مقابلے جیتنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کے پیچھے اپنے ابا جان کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ سو میٹر کا ٹائٹل جیت گئی تو یہ اتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ ابا جان کا دل موم ہو جائے گا۔ ایک بار وہ خود کو ثابت کر دے پھر ابا جان کی بات مانتے ہوئے وہ کھیل کا میدان چھوڑ دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ کوئی انہونی ہو جاتی اور ابا جان کچھ شرائط کے ساتھ اسے ایتھلیٹکس کے ساتھ جڑے رہنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ کسی وقت اس کی ٹائمنگ 12.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی اور یہ نشو بگٹی کی عمومی ٹائمنگ سے بہتر تھی۔
ذوالقرنین والا معاملہ بھی بظاہر سردخانے میں چلا گیا تھا۔ تین چار ہفتے گزر چکے تھے، اس کی طرف سے مزید کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس "ایڈونچر" میں اس کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ نور ڈرنے اور دبنے والی لڑکی نہیں تھی۔
فرہاد والی صورتِ حال بھی جوں کی توں تھی۔ اس نے نور سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر کاربند تھا۔ کسی وقت آمنا سامنا ہو جاتا تو اس کا رویہ اتنا نارمل ہوتا کہ کسی کے لیے کسی طرح کے شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مہینے کے آخر میں طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف ایک بار چند منٹ کے لیے دونوں میں ٹیلیفونک رابطہ ہوا۔ یہ مختصر سا بے ضرر رابطہ نور کو بڑا اچھا لگا۔ اس کے اندر جیسے ایک خلا سا پورا ہو گیا۔ ایک بے نام خوشی اس کے اندر پیدا ہوئی...... ہاں کوئی تھا جو دل کی گہرائی سے اسے چاہتا تھا...... اس کے لیے دعا کرتا تھا...... اسے سوچتا تھا اور اس کی آس رکھتا تھا۔ یہ احساس بڑا حوصلہ افزا اور توانائی بخش تھا۔
دوسری طرف شاہینہ کے پندونصائح بھی جاری تھے۔ وہ بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔
اس روز نور نے اقرار نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ جان چکی تھی کہ نور اور اسپورٹس ایڈیٹر فرہاد رازی کے درمیان کوئی "راز" موجود ہے۔ وہ اکثر اسے فون کر دیتی اور محتاط رہنے کی یاددہانی کراتی۔
ایک دن نور نے مذاق میں کہہ ہی دیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں شاہینہ کہ تم خود...... اس میں دلچسپی محسوس کرنے لگی ہو۔"
"بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم رہو گی پینڈو کی پینڈو ہی۔ تمہارے بھلے کا کہتی ہوں۔ ان ماڈرن شہری لڑکوں کے داؤ پیچ بتا رہی ہوں تمہیں۔ ٹھیک ہے، نہیں تو نہ سہی۔" اس نے فون بند کر دیا۔
نور اپنی جگہ بیٹھی کچھ دیر مسکراتی رہی پھر اس نے شاہینہ کو رنگ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں اس نے کال ریسیو کی۔ سوری کرنے کے بعد نور بولی۔ "یار! مذاق کر رہی تھی۔ تمہاری ہمدردی اور محبت ہر شبہے سے بالاتر ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میری حدیں اور میری ذمے داریاں کیا ہیں اور یہ بھی پتا ہے کہ نشو ہم دونوں کی مشترکہ حریف ہے۔ ہمیں اسے ہرانا ہے اور ہر صورت ہرانا ہے......"
"اور مجھے پتا ہے کہ اسے تم ہی نے ہرانا ہے۔ کل میڈم فرحانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کوچ سرمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ان دونوں کو یقین ہے کہ اگلے دو تین ہفتوں میں تمہاری ٹائمنگ میں کم از کم...... کم از کم ایک سیکنڈ کی بہتری اور آئے گی۔"
"یہ تو اللہ کو پتا ہے اور اصل فیصلہ تو اس دن اور اس وقت ہونا ہے جب فائنل اسپرنٹ لگائی جائے گی اور مجھے تو لگتا ہے کہ بہت معمولی مارجن ہوگا۔"
"یہی تو ہوتا ہے کانٹے دار مقابلہ۔" شاہینہ نے کہا۔
سالانہ ایونٹ میں اب بس بیس روز باقی تھے۔ تناؤ میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ تایا ابا اور ماموں مراد اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اس کی ڈائٹ کا مکمل خیال رکھا جا رہا تھا اور تربیتی سیشن بھی باقاعدگی سے اٹینڈ کرائے جا رہے تھے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت پھپھو حاجرہ کے کہے ہوئے الفاظ نور کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ انہوں نے ایک روز کہا تھا۔ "کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا نور! یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لگی ہے۔"
ایسے وقت میں وہ کانپ جاتی۔ نماز پڑھنے کے بعد دیر تک دعا مانگتی رہتی...... "اے رب کریم! مجھ پر رحم فرما۔ اپنے ابا جان کے حوالے سے مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، مجھے اس کا ازالہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دل میں میرے لیے رحم ڈال دے میرے مالک۔ میں اندھی ہوگئی ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے راستہ سوجھا دے۔"
ایک بار اس کے دل میں آئی کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر گھر چلی جائے اور ابا جان کے قدموں میں سر رکھ دے۔ اسے معلوم تھا کہ آپی بتول بھی ملتان سے آئی ہوئی ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ سب مل جل کر اسے ابا جی سے

معافی دلا دیتے لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر پائی ...... اور اس نے تایا ابا کی ہدایت کے مطابق سب کچھ سالانہ ایونٹ کے بعد پر چھوڑ دیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس ایونٹ میں نور کی کامیابی کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ شاہینہ کے حوالے سے بھی توقعات بہت بلند تھیں۔ مقابلے سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ نور نے آخری پہر کو اٹھ کر دیکھا۔ تایا ابا حسبِ معمول تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی میں وضو کا یا شاید...... آنسوؤں کا پانی چمک رہا تھا۔ انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور جینز کی پتلون پنڈلیوں کے وسط تک اڑسی ہوئی تھی۔

وہ انہیں دیکھتی رہی۔ ابا جان کی نسبت تایا ابا زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ وہ ہر معاملے کو معروضی انداز میں دیکھنے کے عادی تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے نور کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قالین پر ان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور کوئی آیت پڑھ کر اس پر پھونکی...... پھر عجیب وجدانی سے لہجے میں بولے۔ ''نور بیٹا! تم بہت محنت کر رہی ہو اور یاد رکھو، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس حوالے سے دیر تو ہو سکتی ہے لیکن اندھیر کبھی نہیں ہوتی۔ ہمارے قائد نے یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم کی جو بات کی تھی، وہ اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جب مشکلات کے باوجود عملِ پیہم رہتا ہے تو پھر وہ مقام آ جاتا ہے جب خدا بندے سے خود پوچھتا ہے...... بندے تو بتا تو کیا چاہتا ہے۔''

اس نے تایا ابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی تایا ابا۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ سوچا ہے، اسے عملی شکل دینے کے لیے ہر حد تک جاؤں گی۔''

''مجھے یقین ہے، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ہم نے اس نامعقول کو دکھانا ہے کہ بیٹے نہ ہوں تو بیٹیاں بھی بیٹوں جیسے کام کر کے اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کر سکتی ہیں۔''

نور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ تایا ابا نے اس کا سر چوما۔ ''مجھے بیٹی کی بڑی خواہش تھی۔ شرجیل اور عثمان پیدا ہو چکے تھے۔ مہرین کی پیدائش ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر جیسے ایک بڑا خلا سا تھا۔ وہی دن تھے جب اشفاق کے ہاں تم نے جنم لیا۔ تم سارے گھر کی اور خاص طور سے میری لاڈلی بن گئی تھیں۔ میں تمہیں سارا سارا دن گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ تم نے صرف سات ماہ کی عمر میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ سب دنگ رہ گئے تھے۔ ایک سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تم باقاعدہ بھاگنے لگی تھیں۔ میں تمہیں مشکل سے پکڑتا تھا اور تمہیں لان کی گھاس پر لٹا کر تمہاری ٹانگیں دبایا کرتا تھا...... تمہیں وہ باتیں تو یاد نہیں ہوں گی؟''

''کچھ کچھ...... دھندلے دھندلے سے منظر یاد ہیں تایا ابا۔''

''تم تین چار سال کی تھیں، جب میلے کے موقع پر تم سب بچوں نے حویلی کے سامنے والے باغ میں دوڑیں لگائی تھیں۔ تم نے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو ہرا دیا تھا۔ میں نے اس وقت پتا ہے تمہاری تائی سے کیا کہا تھا؟''

وہ سوالیہ نظروں سے تایا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولے۔ ''میں نے کہا تھا یہ نور ہے...... اور نور کی رفتار 299274 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔''

نور مسکرا دی۔ مصلے پر بیٹھے ہوئے تایا ابا بھی مسکرا دیے۔ نور کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولے۔ ''آج میں پھر کہتا ہوں۔ تم نور ہو......''

تایا ابا کی باتوں نے نور میں ایک نئی امنگ، ترنگ پیدا کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس موقع پر اس کا یہ دل بھی چاہا کہ وہ تایا ابا کو فرہاد کے حوالے سے تھوڑا بہت بتا دے۔ اشارتاً ہی ذکر کر دے لیکن پھر اس نے یہ کام بھی ایونٹ کے بعد تک اٹھا رکھا۔

☆☆☆

سو میٹر کی دوڑ کا ٹریک تھا اور کالج کے گراؤنڈ میں یہ ایک طرح کی فائنل ریہرسل تھی۔ کوچ میڈیم فرحانہ نے کہا۔ ''نور! تم سمجھو کہ مقابلہ کل نہیں آج ہے اور یہ تمہاری فائنل ہیٹ ہے۔ اس میں تم نے اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ گھٹنوں پر جھک جاؤ، اپنے پاؤں کو فٹ بلاکس پر پوری طرح ایڈجسٹ کرو۔ نظر ٹارگٹ پر...... اور یہ بات یاد رکھو اسٹارٹ کی بے حد اہمیت ہے۔ او کے...... تم تیار ہو؟''

''یس میڈم!'' نور نے جھکے جھکے اپنا سر اٹھایا اور ٹارگٹ پر نگاہیں جما دیں۔

''ایک بار پھر کہہ رہی ہوں۔ تم نے ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ کانوں کو پسٹل کی آواز پر مرکوز رکھو...... ریڈی......''

نور نے سانس اندر کی طرف کھینچی۔ اس کی تمام تر توانائی جیسے اس کے جسم کے نچلے حصے اور خاص طور سے اس کے پاؤں میں جمع ہو چکی تھی۔ اس کے ارد گرد تین چار اسپرنٹرز اور بھی تھیں...... ہاں یہ فائنل ریہرسل تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی نور گولی کی رفتار سے اپنے

ٹارگٹ کی طرف بڑھی۔ اب تک اس کا سب سے اچھا ٹائم 12.90 تھا۔ آج وہ اس کو بیٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی توانائی کے ساتھ...... اور جب اس نے فنش لائن کراس کی، میڈم فرحانہ اور مسز وجدان کا مشترکہ نعرہ نور کے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ اپنے مومنٹم میں بیس تیس میٹر تک بھاگتی چلی گئی پھر اس نے مڑ کر اپنی کوچ اور ٹیچر کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں اسٹاپ واچز تھیں اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ نور نے 12.50 کا ٹائم حاصل کر لیا تھا اور یہ رزلٹ اس امر کی نہایت روشن امید تھا کہ وہ کل پہلی پوزیشن حاصل کر لے گی۔ بہر حال حتمی فیصلہ تو کل میدان میں ہونا تھا۔

نور کی فرینڈز نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر آج اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کر لیا تو وہ انہیں ٹریٹ دے گی۔ اب وہ اس کے درپے ہو گئی تھیں۔ نور نے سینٹر کے فون سے تایا کو کال کی اور انہیں بتایا کہ آج وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کی گاڑی پر آ جائے گی۔

دراصل وہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ کر رہی تھی۔ چار دن بعد عید کا تہوار بھی تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ تو اسے فرہاد کو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ واپسی پر وہ چند منٹ کے لیے بازار میں بھی رک جائے گی اور فرہاد کے لیے کوئی گفٹ پیک خرید لے گی۔

تین فرینڈز فوکسی کار پر ایک قریبی آئس کریم پارلر میں چلی گئیں۔ نور بالکل پرہیزی ڈائٹ لے رہی تھی، ایک کپ آئس کریم کی گنجائش تو یقیناً نکل ہی سکتی تھی۔ وہ پارلر کی گیلری میں جا بیٹھیں اور آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر بعد اچانک نور کی نگاہ نیچے ہال میں ایک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بری طرح چونکی، وہاں فرہاد موجود تھا۔ اس کے دو دوست بھی تھے۔ تینوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ نور نے ذرا دھیان سے دیکھا اور اسے دوسری بار چونکنا پڑا۔ فرہاد سے گپیں ہانکتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک کی صورت نور کو شناسا لگ رہی تھی۔ یہ وہی سرخ شرٹ والا لڑکا تھا جس نے ان کی گاڑی سے موٹر سائیکل ٹکرائی تھی اور پھر تایا ابا سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔

یقیناً یہ وہی تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے فرہاد کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا...... نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور ذرا، ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس شخص سے فرہاد کی دوستی کب اور کیسے ہوئی؟ فرہاد نے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں کھد بدی ہونے لگی۔ آرڈر آ چکا تھا۔ وہ بے دلی سے آئس کریم کھانے لگی۔ نیچے ہال کمرے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ تینوں دوستوں میں کسی بات پر تکرار چل رہی تھی۔ پھر یہ باقاعدہ جھگڑے کی شکل اختیار کرنے لگی...... دوستوں میں تفریح کے دوران میں اکثر تلخی کی صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ تلخی کچھ زیادہ تھی۔ غالباً ان کے درمیان کسی کیمرے اور ادھار رقم کی بات ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکا جس کا حوالہ سرخ شرٹ تھا، فرہاد کا گریبان دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تیسرا دوست ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ ہیڈ ویٹر اور ایک دوسرے شخص نے بھی مداخلت کی اور بہ مشکل بیچ بچاؤ کرایا۔ سرخ شرٹ والا جو آج نیلی دھاری دار قمیص میں نظر آ رہا تھا، بکتا جھکتا باہر چلا گیا۔

پتا نہیں کہ اچانک نور کے دل میں کیا آئی۔ اس نے دونوں فرینڈز سے کہا۔ ”پلیز، تم دونوں ادھر ہی میرا انتظار کرو...... میں ابھی آتی ہوں۔“

ان دونوں کو حیران چھوڑ کر وہ بائیں جانب والی سیڑھیاں اتری اور اس جانب بڑھی جدھر نیلی قمیص والا گیا تھا۔

وہ لڑکا اسے پارلر سے کچھ فاصلے پر اپنی موٹر بائیک کو جھلاہٹ میں ککس مارتا مل گیا۔ نور نے اپنا اسکارف تھوڑی سے اوپر ہونٹوں تک کھسکایا اور اس کے پاس پہنچ کر بولی۔ ”ایکسکیوز می، میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتی ہوں؟“

ایک اسمارٹ لڑکی کو اپنے روبرو دیکھ کر لڑکے کے چہرے سے جھلاہٹ رفو چکر ہو گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”آپ کون؟“

لڑکا چند منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنی موٹر بائیک کو پھر سے لاک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ نور اس کے ساتھ چند سیڑھیاں اتر کر پارک میں پہنچ گئی۔ یہاں سایہ دار درخت تھے اور پھولوں کے پودے بھی تھے۔ وہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان جو ابتدائی گفتگو ہوئی، اس میں لڑکے کا نام پرویز معلوم ہوا اور نور پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ دو ڈھائی سال سے فرہاد کا دوست ہے۔ وہ وی سی آر اور کیمروں وغیرہ کی ریپئرنگ کا کام کرتا تھا، اس کی اپنی دکان تھی۔

گفتگو کے دوران میں پرویز نے اچانک چونک کر نور کی طرف دیکھا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ”معاف کریں۔ کہیں آپ کا نام نور تو نہیں؟ وہی جو اسپرنٹ میں حصہ لیتی ہیں؟“

نور نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ”آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟“

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ”آپ کا بہت تذکرہ ہوتا رہتا ہے نور صاحبہ، وہ...... جو کچھ آپ کے ساتھ کررہا ہے......ہم کو پتا ہے۔“

”ہم...... میں کچھ سمجھی نہیں؟ کون وہ؟“

”آپ سمجھ سکتیں...... تو اب تک...... اس کے چکر سے نکل چکی ہوتیں...... خیر چھوڑیں...... اب آپ کا کھیل ختم ہوچکا ہے۔ اب آپ نے خود ہی اس ”الو بنو“ چکر سے نکل جانا ہے۔“

”الو بنو؟“ نور کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”جی ہاں...... الو بنایا جاتا رہا ہے آپ کو۔ سیڑھی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کسی اور تک پہنچنے کے لیے۔“

نور کے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ جیسے روہانسی ہو کر بولی۔ ”کیا...... تم یہ سب کچھ فرہاد کے بارے میں کہہ رہے ہو؟“

”تو اور کس ذات شریف کا ذکر ہورہا ہے۔“

پتا نہیں کیوں نور کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ پرویز نامی لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے، بے بنیاد نہیں ہے۔

اس نے اس سے درخواست کی کہ اگر اس نے یہ بات چھیڑ دی ہے تو پھر اسے ادھورا نہ رکھے۔

پرویز تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے نور سے کہا کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کل کسی جگہ مل کر یہ بات کرسکتے ہیں۔ نور کل تک کا انتظار کیسے کرسکتی تھی۔ اس نے پرویز کو مجبور کیا۔ وہ پارک سے اٹھ کر مارکیٹ کی عقبی سمت ایک کیفے میں آن بیٹھے۔ رازداری کی شرط پر پرویز نے جو کچھ بتایا، وہ شاید پرویز کے لیے تو بہت زیادہ اہم نہ ہو لیکن نور کے لیے تہلکہ خیز تھا۔ اس نے کہا۔ ”نور صاحبہ! یقیناً تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ فرہاد تم سے نہیں تمہاری دوست شاہینہ سے محبت کرتا ہے اور یہ چکر تمہارے والے چکر سے بھی پہلے کا ہے۔ فرہاد اور شاہینہ کے درمیان کچھ دوری پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے گیم میں بہت زیادہ مگن ہو کر اس کو Avoid کرنے لگی تھی۔ شاہینہ میں حسد پیدا کرنے کے لیے ہی فرہاد نے تم سے راہ و رسم بڑھائی اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا ہے۔“

”میں...... یہ نہیں مانتی۔“

”سوری مس! تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ دونوں پریمی پھر ایک ہوچکے ہیں۔ اب بہت جلد تمہیں اپنے مقام کا بھی پتا چل جائے گا۔“

نور کی نگاہوں کے سامنے ماضی قریب کے مناظر گھومنے لگے۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو شاہینہ وقتاً فوقتاً اس سے کہتی رہی تھی۔ اس نے شروع میں ڈھکے چھپے انداز میں اسے فرہاد سے دور رہنے کے مشورے دیے تھے۔ نور سے کہا تھا کہ وہ کہیں اس سے فلرٹ نہ کررہا ہو...... اور اس طرح کی کئی اور باتیں لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ نور سے فرہاد کا تعارف ایک ایکسیڈنٹ کے بعد اتفاقیہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اتفاقیہ نہیں تھا۔

پرویز نے بھی اس کی تصدیق کی۔ نور سے ایک بار پھر رازداری کا وعدہ لینے کے بعد اس نے بتایا۔ وہ سب فرہاد کی پلاننگ تھی۔ وہ دن رات شاہینہ کے لیے تڑپ رہا تھا اور اسے واپس اپنے پاس لانے کے منصوبے سوچتا تھا۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا پلاننگ کے ساتھ ہوا۔

”تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے؟“ نور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”شاید تم کوئی گواہ مانگ رہی ہو یا کوئی تصویر وغیرہ دیکھنا چاہتی ہو لیکن میں تمہیں اس کا ”لائیو“ ثبوت دے دیتا ہوں اور وہ بھی آج ہی بلکہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو پرویز صاحب؟“

”دونوں پریمی آج کل ڈیفنس کے ”اوڈی کافی ہاؤس“ میں مل رہے ہیں۔ آج بھی ملیں گے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔“

نور کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز گردش کررہی تھی۔ اس کا ذہن دھندلایا ہوا تھا۔ پرویز سے رخصت ہو کر وہ سیدھی آئس کریم پارلر پہنچی۔ اس کی دونوں دوست بے حد پریشان تھیں اور اب وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہی تھیں۔ نور نے ان سے معذرت کی۔ وہ دونوں شدید الجھن میں تھیں اور اسی الجھن میں وہاں سے رخصت ہوگئیں کیونکہ نور نے انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد نور نے گھر فون کیا اور تائی جان کو بتایا کہ اسے تھوڑی سی مزید دیر ہوجائے گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

اس کام کے بعد اس نے ایک آٹو رکشا لیا اور اس ایریا میں جا پہنچی جہاں معروف اوڈی کافی ہاؤس واقع تھا۔ وہ بڑی نکھری ہوئی روشن شام تھی مگر نور کے لیے اس میں

تاریکی اور نوحے کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... اور پھر وہ جان لیوا گھڑی بھی آئی جب اس نے کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں شاہینہ اور فرہاد کو ہنستے اور باتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرہاد فیشن کے طور پر شیشا پی رہا تھا اور شاہینہ ایک کپ سے چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ پونی ٹیل باندھے ہوئے تھی۔ شاید رننگ کرنے کے بعد سیدھی یہاں آگئی تھی۔ کل اس نے بھی اہم ترین مقابلے میں حصہ لینا تھا۔

وہ شام اور وہ رات نور کے لیے بڑی عذاب ناک تھی۔ تایا ابا نے صدقے کے طور پر بکرے کی قربانی دی تھی۔ گھر میں سب نور کے لیے دعائیں کر رہے تھے، منتیں مان رہے تھے اور وہ جیسے اندوہ و ناتوانی کے اتھاہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ذرا ستانے کے بہانے وہ بند کمرے میں چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس نے فرہاد کو چاہا تھا اور دل و جان سے چاہا تھا۔ اس حوالے سے اس کی کنواری آنکھوں میں ان گنت سپنوں نے جگہ بنائی تھی۔ وہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا...... اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ندامت اور شرمندگی کے گہرے غار میں جا گری تھی۔ اس شخص نے شاہینہ کی محبت پانے کے لیے بڑی بے رحمی سے نور کا استعمال کیا تھا اور وہ بڑی سادگی سے استعمال ہوئی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی۔ ان لڑکیوں کو نادان سمجھتی تھی جو تکیے بھگوتی ہیں لیکن آج اسے خود رونا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک آنسو بہانے کے بعد اسے اپنے دل کا بوجھ قدرے کم محسوس ہوا...... مگر جو غم تھا وہ تو ہر رگِ جاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ واش روم میں جا کر بہت دیر تک منہ دھونے اور چہرے پر لوشن وغیرہ لگانے کے باوجود وہ اپنے رونے کے آثار چھپا نہیں سکی اور اس روز اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جب غم آنکھوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے چھپانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بند کمرے سے باہر سب چہک رہے تھے۔ ان کی امیدیں جوان تھیں اور وہ کل کا انتظار کر رہے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ کل جس لڑکی نے سالانہ کھیلوں میں حصہ لینا ہے وہ اندر سے مر گئی ہے۔

حوصلے کیسے ٹوٹتے ہیں، توانائی، ناتوانی میں کیسے بدلتی ہے، منزلیں نگاہوں کے سامنے کیسے دھندلاتی ہیں، یہ نور کو اس روز پتا چلا...... اور ہزاروں لوگوں کے سامنے چلا۔ وہ سو میٹر کی فائنل "ہیٹ" تک تو پہنچ گئی...... مگر وہ پہلا نمبر حاصل نہیں کر سکی۔ دوسرا اور تیسرا بھی نہیں کر سکی۔ وہ چوتھے نمبر پر آئی۔ یہ بہت بڑا اپ سیٹ تھا۔ نور کے سپورٹرز کے لیے بڑا بھی اور غمناک بھی۔ وہ تو 12.50 کی ٹائمنگ حاصل کر چکی تھی، پھر اتنا پیچھے کیسے رہ گئی۔ جو اس پر گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے۔

ریس ہارنے کے بعد نور کی نگاہ سب سے پہلے اپنے تایا ابا پر ہی پڑی۔ ان کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے آنسو بہ مشکل روکے ہوئے ہیں پھر اس نے اپنی محبوب ٹیچر اور کوچ میڈم فرحانہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور تھکے تھکے انداز میں چلتی، تماشائیوں کے اسٹینڈز کی طرف آگئی۔

تایا ابا نے آگے بڑھ کر نور کو گلے لگایا اور پیٹھ تھپکی۔ "کوئی بات نہیں...... ہار جیت کھیل کا حصہ ہے، ہمارا کام کوشش کرنا ہے...... اور ہمت برقرار رکھنا ہے۔" ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

بسمہ بھی چوری چھپے یہ ریس دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے کزنوں مہرین، شرجیل اور عثمان وغیرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آدھے نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا لیکن بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے نور کو تسلی دی۔ "کوئی بات نہیں۔ پورے پنجاب میں چوتھا نمبر ہے تمہارا۔ آگے اور چانس ملیں گے۔"

یہ ریس نشو بکلی نے جیت لی تھی۔ لاہور کی شاہینہ کا دوسرا نمبر آیا تھا۔ نشو اپنی ایسوسی ایشن کے بینر کے ساتھ پورے گراؤنڈ میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کی سپورٹر لڑکیاں ساتھ تھیں۔ نشو خاص طور پر اس جگہ رکی جہاں نور اپنے کوچز اور ساتھیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ یہاں ان سب نے خوب نعرے لگائے اور فقرے اچھالے۔ اسپیکر پر کمنٹری کرنے والے صاحب نشو کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پیشین گوئی کر ڈالی کہ نشو اسپرنٹ کے میدان کا سب سے تابناک...... ابھرتا ہوا ستارہ ہے اور وہ نیشنل گیمز میں بھی میدان مار لے گی۔

"کوئی بات نہیں نور صاحبہ! ایسے اپ ڈاؤن آتے ہی ہیں۔" یہ آواز نور کے عقب سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں فرہاد کھڑا تھا۔ میگزین "سپر اسٹار" کا وجیہہ اسپورٹ ایڈیٹر۔ اس کے خوبصورت بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ کتنا معصوم اور سادہ نظر آتا تھا۔ ہاں، یہی شخص تھا جس نے آج ایک نہایت اہم سنگِ میل نور سے چھینا تھا...... ہاں یہی تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ایونٹ کے بعد نور بیمار ہوگئی۔ اسے بخار ہوا، بعد میں پتا چلا کہ ملیریا ہے۔ وہ اس کے لیے بڑے مایوس کن دن تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو ہاری اور دھتکاری ہوئی محسوس کرتی تھی حالانکہ تایا ابو اور تائی اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ تینوں کزن شرجیل، عثمان اور مہرین بھی ہر طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ ایک روز پھپھو حاجرہ آئیں۔ تائی راحت اس وقت مہرین کو لینے کالج گئی ہوئی تھیں۔

پھپھو نے کہا۔ ”بتا کیا ملا تجھے اپنے باپ کا دل دکھا کر۔ کون سا میدان مار لیا ہے تو نے جس کی وجہ سے تیرے پالنے والوں کا سر اونچا ہوگیا ہے؟ بڑے لمبے چوڑے وعدے کر رہے تھے بڑے بھائی جان بھی......“

”آپ تایا جان کو کچھ نہ کہیں پلیز۔“ نور نے کہا۔

”انہی کے بے جا لاڈ نے تیری ہڈیوں میں دکھے ڈالے ہیں۔ بھائی جان اور باجی راحت دونوں قصوروار ہیں۔“

”پلیز پھپھو...... پلیز...... چپ ہوجائیں۔“

وہ عینک کے پیچھے سے دکھ آمیز غصے سے نور کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ”دیکھ نور! اب بھی وقت ہے سنبھل جا۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑا آئیڈیل اور کوئی نہیں ہوتا کہ اس کے پالنے والے اس سے راضی ہوں اور اس کا گھر بس جائے۔ اپنے ابا جی سے معافی مانگ لے۔“

”آپ، معافی کہتی ہیں۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہوں مگر وہ مجھ پر کچھ رحم تو کریں۔ مجھے اس طرح تو گھر سے دھکا دے کر نہ نکالیں۔ میں نہیں کرنا چاہتی ابھی شادی۔“

”تو اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ تیرے دماغ میں کیڑا ہے...... اور وہ کیڑا ابھی ہے کہ تو شاید کوئی بہت بڑی کھلاڑی بننے والی ہے۔ نہیں بنے گی تو۔ کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ جو بچے اپنے والدین کی بددعا لیتے ہیں وہ کسی جگہ بھی کامیاب نہیں ہوتے......“

پھپھو اشارتاً اس ناکامی کا ذکر کر رہی تھیں جو چند دن پہلے اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ اس ناکامی کے پیچھے کیا سنگین حالات تھے۔ کس طرح کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے کیے تھے اور اسے مٹی کا ڈھیر کر ڈالا تھا۔

وہ خود سے ہرگز ناامید نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ کرسکتی ہے۔ اپنے تایا ابا اور اپنے دیگر چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکتی ہے۔ اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کیا ہوا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

پھپھو اسے جلی کٹی سنا کر چلی گئی تھیں۔ نور ان سے گھر کے حالات پوچھنا چاہتی تھی، خاص طور سے بسمہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی کہ چودھری طغرل کے بیٹے سے اس کا پیچھا چھوٹا ہے یا نہیں...... لیکن پھپھو اسے کوئی موقع دیے بغیر بھناتی ہوئی باہر چلی گئی تھیں۔ (ویسے نور کو اتنا پتا چل چکا تھا کہ جو مقامی ایم پی اے یہ مسئلہ حل کرا رہا تھا، اسے کامیابی ملی ہے اور وہ کھاپری برادری کے لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اب ابا جان اور پھپھو وغیرہ کہیں بسمہ کی منگنی کا سوچ رہے ہیں)۔

چند دن بعد نور کا بخار اتر گیا...... اور وہ ایک بار پھر ٹریک پر آگئی۔ اس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اس نے فرہاد کے تصور کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی کوشش کی تھی اور بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اسے تھوڑا سا شکوہ شاہینہ سے بھی تھا کہ ایک بے تکلف دوست ہوتے ہوئے بھی اس نے اسے شروع میں ہی اصل صورتِ حال سے آگاہ کیوں نہ کر دیا۔ اسے فرہاد سے دور رکھنے کی کوشش تو کرتی رہی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ شاید اس کی بھی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ اس سے اب بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ فرہاد سے بھی دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اور اس کے دوست ڈاکٹر فیضان نے تایا جان کے فری کلینک میں بھی شکل نہیں دکھائی تھی۔ تایا ابا اس سلسلے میں فرہاد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر رابطہ نہیں ہوسکا تھا...... انہوں نے ایک اور ڈاکٹر ہائر کر لیا تھا۔ یہ بات اب پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ یہ سب فرہاد کا ڈراما تھا۔ مہرین کو بھی اس ڈرامے کا شک ہوچکا تھا۔

سب کچھ بھول بھال کر نور نے ایک بار پھر ایف اے ایس جانا شروع کر دیا۔ اب وہ نیشنل گیمز کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے کوچز اس کی طرف سے پُرامید تھے۔ وہ چھوٹے بڑے مقابلوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ اس کی ہیڈ کوچ فرحانہ بیگ نے اس کی ایک خامی نوٹ کی...... وہ کسی وقت فالس اسٹارٹ (غلط شروعات) کر جاتی تھی۔ اہم مقابلوں میں فالس اسٹارٹ کی وجہ سے بڑے بڑے ایتھلیٹ ڈس کوالیفائی ہوجاتے ہیں اور ان کے کیریئر داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ فرحانہ بیگ نے دن رات محنت کی اور نور کی اس کمی کو پچانوے فیصد تک درست کر دیا۔ وہ تکنیک کے ہر پہلو پر توجہ دے رہی تھیں۔ ٹریک پر پوزیشن کیسے لینی ہے...... فٹ بلاکس کا بہترین استعمال کیسے ممکن ہے؟ کس طرح جھک کر اپنے ہاتھوں کو اسٹارٹنگ لائن سے ٹچ کرنا ہے۔ فنش لائن پر پہنچتے ہوئے خود کو کس طرح آگے جھکانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف نور کی اہم ترین حریف نشو بجلی کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ اس کے والد اور چچا نہ صرف اسپورٹس مین تھے بلکہ سیاسی اثر رسوخ بھی رکھتے تھے۔ کہا جارہا تھا کہ نشو کے اہلِ خانہ نے اسے پرائیویٹ طور پر انگلینڈ کا دورہ کرایا ہے۔ وہاں اس نے غیر ملکی کوچز سے بھی "ٹپس" لیے ہیں اور ممکن ہے کہ انگلینڈ سے کوئی کوچ اس کی ٹریننگ کے لیے پاکستان بھی آئے۔

شاہینہ کے حوالے سے اطلاعات تھیں کہ وہ سرگرمی سے تربیت میں حصہ نہیں لے رہی پھر ایک روز نور کی تایا زاد مہرین نے اسے رازداری کے انداز میں خبر سنائی۔ "تمہیں پتا ہے کہ شاہینہ کی شادی ہو رہی ہے؟"

"کیا؟" نور حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہاں جی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا ہے اور لڑکا پتا ہے کون ہے؟"

"کون؟"

"وہی ذات شریف جس نے ہمارے روبرو رقائے عامہ کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور ابا جان کے فری کلینک میں کردار ادا کر رہا تھا...... فرہاد رازی۔ سنا ہے کہ اس چٹ منگنی پٹ بیاہ کے پیچھے فرہاد رازی کا کوئی راز ہے۔" مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"دونوں نے تعلقات بنا رکھے تھے۔ ایک دن شاہینہ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے گر گئی۔ پتا چلا کہ وہ "پریگننٹ" ہے۔ شاہینہ کے والدین نے فرہاد کو جا دبوچا۔ وہ کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں۔ انہوں نے فرہاد کے سامنے دو آپشن رکھے۔ شادی کر دیا پھر بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ شادی بھگتنے کو تیار ہو گیا۔"

نور نے یہ سب کچھ سناٹے میں سنا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس کی دوست اور کولیگ کے "رنگین کیریئر" کا اختتام اس طرح ہو گا۔ شاہینہ اور فرہاد کی اس کہانی میں ایک کردار نور کا بھی تھا اور یہ کردار اس سے زبردستی کروایا گیا تھا۔ وہ اس کردار اور اس سے وابستہ ساری تلخ یادوں کو اب ہمیشہ کے لیے ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی۔

چند روز بعد واقعی شاہینہ کی شادی ہو گئی۔ اس شادی کی خبر نور کو ایک مشترکہ فرینڈ کے ذریعے ہی ملی تھی۔

نور پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن تھی۔ یہ بڑا کٹھن راستہ تھا۔ وہ تایا جان یا پھر ماموں مراد کے ساتھ صبح منہ اندھیرے الیف اے ایس پہنچ جاتی تھی۔ وارم اپ ہوتی، اسٹریچنگ کرتی، تب کئی کلومیٹر کی دوڑ اور پھر سومیٹر کے ڈیش لگاتی۔ وہ تھک کر چور ہو جاتی، کئی مرتبہ اسے لگتا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے خون بہہ نکلے گا۔ جب وہ جان توڑ محنت کر رہی ہوتی اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال ہوتا۔ وہ اپنے تایا جان کو سرخرو دیکھے، تایا جان بھی ہر دستیاب سہولت اس کے لیے فراہم کر رہے تھے۔

تایا زاد بہن مہرین فزیو تھراپسٹ بھی تھی۔ یہ سہولت نور کو گھر میں ہی مل گئی تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہوتا تو مہرین فوراً اس کی مدد کو آ جاتی۔ ایک روز نور کو گھٹنے میں ہلکا سا کھچاؤ محسوس ہوا۔ تایا کی ہدایت پر مہرین نے فوراً فون پر اپنی سینئر پروفیسر سے مشورہ کیا اور نور کے مساج میں لگ گئی۔

نور جلد ہی بہتر محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ "مہرین! کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔"

"اسی منہ سے کر دیا کرو۔ کافی پیارا ہے، جب کس کر پونی ٹیل باندھتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ شاید فلورنس بھی ایسے ہی باندھتی ہو گی دوڑتے وقت۔"

فلورنس ایک طرح سے نور کا آئیڈیل تھی۔ ہر کھلاڑی کا کوئی نامور کھلاڑی آئیڈیل ہوتا ہے۔ نور کے بھی اسی طرح کچھ آئیڈیل تھے۔ سومیٹر کی امریکن ریکارڈ ہولڈر فلورنس...... جس کی ٹائمنگ **10.49** سیکنڈ تھی۔ یہ ٹائمنگ ہرا سپرنٹر کے دل و دماغ میں ایک روشن سنگِ میل کی طرح جگمگاتی تھی...... اور پھر انڈین پی ٹی اوشا، جس نے جکارتہ میں **11.39** کی ٹائمنگ حاصل کی تھی اور پاکستان کی ایتھلیٹکس کا جگمگاتا ستارہ عبدالخالق جو مردوں کی کیٹگری میں **10.04** کی ٹائمنگ کے ساتھ ایشیا کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔

وہ بھی خود کو ایسے ہی چمکتے دمکتے ستاروں کے درمیان یا ان کے آس پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ ایک عورت کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے کی آرزو رکھتی تھی...... تاکہ آپی بتول کے شوہر جیسے مرد...... اور ذوالقرنین جیسے مرد...... اور فرہاد جیسے مرد...... اس کی حیثیت کو تسلیم کریں۔

مہرین کے جادوئی لمس نے نور کے گھٹنے کا کھچاؤ یوں چھین لیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

مہرین بولی۔ "تمہیں پتا ہے نور جب میں نے فزیو تھراپسٹ بننے کا سوچا تھا تو چچا جان (نور کے ابا جی) نے بڑی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ مالشیا بننے جا رہی ہے۔ لڑکیوں کو یہ کام زیب نہیں دیتے۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے اور ایسی ہی باتیں ہیں جو ہمیں

سوچنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر تم فزیو تھراپسٹ نہ بنو......
اور دیگر ہزاروں لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں نہ آئیں تو پھر اس
تھراپی کے حوالے سے ایک فیمیل دوسری فیمیل کی مدد کیسے
کرسکتی ہے۔ ہمیں ایسی تنگ نظریوں سے نکلنا پڑے گا۔"

وہ بہت ہی کٹھن اور مشقت والے دن تھے۔ نور کو
ایف ایس سی کا امتحان بھی دینا تھا۔ ٹیچرز کے ساتھ مشورے
سے اس نے اس امتحان کو اگلے سال تک ملتوی کردیا اور تمام
تر توجہ رننگ پر مرکوز رکھی۔ پرنٹ میڈیا کے کئی لوگ اسے
اپنے صفحات پر ہائی لائٹ کرنا چاہتے تھے مگر وہ جیسے......
ایک شخص کی وجہ سے ...... پورے میڈیا سے ہی الرجک
ہوگئی تھی۔ وہ شدید ضرورت کے وقت ہی تصویر اتروائی تھی
اور وہ بھی اسکارف کے ساتھ۔ رننگ کے وقت بھی اس کا
لباس سب سے علیحدہ اور باوقار ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ
ایتھلیٹ کا ظاہری حلیہ اور لباس وغیرہ اس کی راہ میں بھی
رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی، اسے لگا کہ اس کے
پاؤں پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس
نے دیکھا تایا ابا اس کے پاؤں کی طرف موجود تھے، ان
کے ہاتھ میں ایک آئنٹمنٹ کی ٹیوب تھی۔ وہ اس کے ایک
زخمی پاؤں پر دوا لگا رہے تھے۔

"تایا ابا! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟"

"اپنی بیٹی کے زخم پر مرہم رکھ رہا ہوں اور کیا کررہا ہوں؟"

"تایا ابا۔" وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ "زخم کہاں ہے۔
زیادہ رننگ کی وجہ سے تھوڑی سی سرخی آگئی ہے۔"

"میری بچی۔ ایتھلیٹ کے پاؤں کی تھوڑی سی سرخی
بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ اس
معاملے میں غفلت نہ کیا کرو اور کل کا دن ریسٹ کرو۔ یہ میرا
حکم ہے۔"

وہ تایا ابا کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے اس کا
سر چوما۔ اس کے پاؤں کو سہلاتے ہوئے بولے۔ "جب تم
چھوٹی سی تھیں، میں تمہیں دبوچ کر تمہارے پاؤں پر گدگدی
کیا کرتا تھا۔ تم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھیں۔ بہت
گدگدی ہوتی تھی تمہیں تلوؤں پر...... یاد ہے نا؟"

"ہاں تایا ابا...... اور آپ کو میرے گندے پاؤں
بہت برے لگتے تھے۔ آپ مجھے جوتے یا چپل کے بغیر چلنے
نہیں دیتے تھے۔"

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔ "شاید یہ تمہاری
محبت ہی تھی جس کے صلے میں اللہ نے پھر مجھے اپنی بیٹی بھی
عطا کردی لیکن مہرین کی پیدائش کے بعد بھی تمہاری محبت
کبھی کم نہیں ہوئی......"

"آپ کی محبت اور آپ کی توجہ میرے لیے بے حد قیمتی
ہیں تایا ابا۔ شاید اسی محبت اور توجہ کی بدولت میں خود کو ثابت
کرسکوں اور کسی دن میرے ابا جی بھی مجھے واپس مل جائیں۔"

"کیوں نہیں ملے گا وہ...... ضرور ملے گا۔ بس محنت
شرط ہے اور مستقل مزاجی شرط ہے۔ میرا ایمان ہے نور،
محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ وہ رائگاں جا ہی نہیں سکتی۔"

"آپ کا ایمان، میرا ایمان بھی بن چکا ہے تایا ابا۔"

"تم دیکھنا...... اس مرتبہ اللہ تعالیٰ تمہیں محنت کا پھل
ضرور دے گا۔ کل میری بات تمہاری سینئر کوچ سے بھی ہوئی
ہے۔ وہ بہت پُرامید ہیں۔"

اسلام آباد میں ہونے والے قومی کھیلوں کے لیے نور
نے بہ آسانی کوالیفائی کرلیا تھا۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب
ابتدائی دوڑوں (یعنی Preliminary Heats) کے
بعد نور کو فائنل ہیٹ میں حصہ لینا تھا۔ اس ہیٹ میں جو دو تین
اہم مدمقابل موجود تھیں، ان میں ایچی سن کالج کی ایک لڑکی
کے علاوہ نشو بجلی بھی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں میں نور کی ٹائمنگ میں
قریباً 0.30 سیکنڈ کی بہتری آئی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ
بہتری اسے گولڈ میڈل دلانے میں اہم ثابت ہوگی۔

آخر وہ گھڑی آگئی۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ نور
میدان میں پہنچی۔ وارم اپ کے دوران میں نشو بجلی اسے
کڑی نظروں سے گھورتی رہی۔ جیسے نور کو دیکھ دیکھ کر خود کو تاؤ
دلا رہی ہو اور اس تاؤ کو اپنی انرجی بنا رہی ہو۔ نور نے بھی
اس کی گرم نگاہوں کا جواب گرم نگاہوں سے ہی دیا۔ اس
کے قریب سے گزرتے ہوئے نشو نے اپنے بوائے کٹ
بالوں کو پھونک مار کر اپنی پیشانی سے ہٹایا اور سرگوشی کرتے
ہوئے آگے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ آج پینڈو واپس پنڈ
چلی جائے گی۔

گولڈ میڈل ہیٹ اسٹارٹ ہوئی...... پوزیشن لی
گئی...... پسٹل کی آواز کے ساتھ ہی ایتھلیٹس کے رگ
پٹھوں نے بجلی کی طرح رسپانس کیا اور وہ اپنے پاؤں سے
فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے ٹارگٹ کی طرف جھپٹیں۔

پسٹل کی آواز کے فوراً بعد ہی نور کو محسوس ہوا کہ آج
اس کا اسٹارٹ بہت اچھا نہیں تھا۔ بہرحال وہ بھاگنے میں
اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے رہی تھی۔ یہ سارا قریباً 50 قدم کا
کھیل تھا، شاید ایک دو قدم زیادہ۔ قریباً پندرہ قدم کے بعد
نور نے اسٹارٹ کی کمی کو دور کرنے کے لیے اضافی توانائی

لگائی۔ اس وقت نشو اس سے قریباً چار پانچ فٹ پیچھے تھی۔ ایچی سن والی لڑکی کا فاصلہ زیادہ تھا مگر پھر نور کو لگا کہ نشو سے اس کا فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی دائیں آنکھ کے گوشے سے دیکھا، نشو کی آگے بڑھتی ہوئی شبیہہ نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کے برابر آنے کے بعد چند انچ آگے نکل گئی ہے۔ ریس دیکھنے والوں کا شور فلک شگاف تھا۔ آخری مرحلہ بے حد جاں گسل تھا۔ آخری چودہ پندرہ قدموں میں نور نے جسم و جاں کی پوری توانائی صرف کی اور فنش لائن پار کر لی۔

وہ ایک بار پھر ہار چکی تھی۔ نشو نے یہ ریس جیت لی تھی۔ نور کا خیال تھا کہ وہ دوسرے نمبر پر آئی ہے مگر جب فوٹو فنش کا رزلٹ سامنے آیا تو وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ ایچی سن کالج کی ارم نے نہایت تھوڑے مارجن سے اس سے دوسری پوزیشن بھی چھین لی تھی۔ ان دونوں کا فرق صرف 0.08 سیکنڈ رہا تھا۔

نور بے دم سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کی سانس ابھی تک نارمل نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی بار کے موقع پر اس نے اپنے ساتھیوں اور اپنے تایا جان کی طرف دیکھا تھا مگر اس مرتبہ اسے یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ آخر اسے اپنی کمر پر تایا جان کے مشفق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ نور کے آنسو اکثر اس سے روٹھ جایا کرتے تھے۔

لیکن اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ سینے میں ایک ہچکی سی تھی جو آزاد ہونا چاہتی تھی، وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔ تایا جان اس کے کانوں میں تسلی آمیز سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں پر ڈھول کی تھاپ حاوی ہو رہی تھی...... اور وہ نعرے حاوی ہو رہے تھے جو نشو بگلی کے سپورٹرز بلند کر رہے تھے۔ ان لمحوں میں نور کے دل میں خیال آیا۔ کہیں واقعی یہ اباجی کی بددعا تو نہیں جو جان توڑ کوشش کے باوجود اسے کامیابی سے دور رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆

وہ کمرے میں بند تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو شکل ہی دکھانا نہیں چاہتی۔ اس نے رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ تایا جان تو اپنے ماہانہ دورے پر گجرات چلے گئے تھے لیکن تائی راحت اور تینوں کزنز تو گھر میں ہی تھے۔ پہلے مہرین دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ اب شرجیل بار بار دستک دے رہا تھا، گاہے بگاہے تائی راحت کی آواز بھی آ رہی تھی، اس آواز میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ نور نے مایوسی کے عالم میں کوئی ایسی ویسی چیز نہ کھالی ہو مگر ایسی بات نہیں تھی۔

آخر وہ دروازے کے پاس پہنچی اور کراہ کر بولی۔ ”میں ٹھیک ہوں لیکن پلیز...... مجھے ابھی آرام کرنے دیں۔“

”مگر چند نوالے تو لے لو بیٹی۔“ تائی نے دلار سے کہا۔

”ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ آپ سو جائیں، میں خود ہی لے لوں گی۔“

تائی کے بڑبڑانے کی مدھم آواز آئی۔ بہر طور اس کے بعد دستک وغیرہ نہیں ہوئی۔ نور نے کاغذ قلم سنبھالا اور اپنے ابا جان کو ایک خط لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ کافی طویل خط تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

”اباجی! میں آپ کی فرمانبردار بیٹی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو، آپ سے جدا ہو کر میں نے ہر پل آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ کی محبت کو ترسی ہوں، امی کے بعد ہم بہنوں کے لیے آپ ہی تو سب کچھ ہیں۔ وہ واقعہ ایسا اچانک تھا کہ اس نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں تایا ابا کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ مجھے پتا ہے اباجی، میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔ پلیز...... آپ اپنی اس ناسمجھ اور کمزور بیٹی کو معاف کر دیں۔ پلیز اباجی پلیز۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے تو میں خود کو دنیا کی بدقسمت ترین ہستی سمجھتی رہوں گی اور کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔“

اگلے روز اس نے یہ خط مہرین کے ہی ذریعے ابا جان تک پہنچایا تھا۔ دو روز بعد بڑی عید تھی اور اڑتی اڑتی سی یہ خبر بھی آ رہی تھی کہ شاید بسمہ کی کہیں بات پکی ہونے والی ہے۔ یہی دو وجوہات تھیں جن کی بنا پر نور کو ایک بار پھر اپنے گھر میں قدم رکھنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن، شام کے وقت پھپھو اس کے پاس آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئیں۔ اباجی اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ آپی بتول بھی اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ آپی اور پھپھو ”لرزتی کانپتی نور“ کو اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں گئیں۔

اباجی صوفے پر بیٹھے تھے۔ رخ دوسری طرف تھا، پہلے سے کمزور نظر آ رہے تھے۔ پھپھو نے لجاجت سے کہا۔ ”بھائی جان، یہ...... نور آئی ہے۔“

اباجی نے مڑ کر دیکھا۔ نور کو کچھ اور تو نہیں سوجھا، وہ جلدی سے آگے بڑھی اور بیٹھ کر اباجی کا گھٹنا تھام لیا۔ ان کے گھٹنے پر پیشانی رکھ کر اشکبار لہجے میں بولی۔ ”پلیز

ابا جی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے، میں خوش نہیں ہوں...... میں بہت دکھی ہوں......" وہ بولتی چلی گئی۔

انہوں نے اپنا گھٹنا چھڑانے کی کوشش کی مگر نور کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ برہمی سے بولے۔ "یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ پیچھے ہٹو۔"

مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ پھپھو نے ڈرے لہجے میں کہا۔ "چلیں معاف کر دیں بھائی جان...... بڑے معاف ہی کیا کرتے ہیں، اپنی غلطی پر شرمندہ ہے یہ......"

انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ "پیچھے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے جانا ہے۔"

"پہلے آپ مجھے معاف کریں ابا جی۔" اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "اچھا ٹھیک ہے...... پیچھے ہٹو۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور واش روم کی جانب بڑھ گئے۔

اگلے روز عید تھی۔ دونوں گھروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا تھا کہ عید اکٹھے ہی مناتے تھے بلکہ اس میں پھپھو کا گھرانا بھی شریک ہوتا تھا۔ پھپھو کے شوہر عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے۔ عید کی گہما گہمی میں تھوڑا سا حزن بھی شامل تھا۔ نور کی والدہ کی وفات کے بعد یہ پہلی بڑی عید تھی۔ عید کی رات نور نے اپنے گھر میں ہی گزاری۔ اگلے روز پھپھو اور آپی بتول نے نور کو سمجھایا۔ پھپھو نے کہا۔ "دیکھو نور! تمہارے ابا جی نے تمہیں گھر آنے کی اجازت تو دے دی ہے لیکن ان کی اصل ناراضگی اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ شادی پر رضا مند ہو جاؤ۔ وہ تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔"

"پھپھو! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرے لیے آپ سب کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیوں مجھے کچھ دیر کے لیے مزید اپنی محبت کے سائے میں نہیں رکھ سکتے؟"

"یہ محبت ہی تو ہے نور۔" آپی بتول نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "ابا جی، تمہیں اپنے گھر کی ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"انہوں نے آپ کو اپنے گھر کی، دیکھ ہی لیا ہے نا...... اس سے ان کو کچھ تسلی ہو جانا چاہیے۔" نور کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ہر ایک کی اپنی قسمت ہوتی ہے نور۔" پھپھو نے کہا۔ "اور تیرے لیے تو بہت اچھا رشتہ آیا تھا...... تیری وجہ

سے وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا۔ دین دار، کماؤ اور بڑوں کے سامنے سر جھکا کر رکھنے والا۔ آج کل ایک مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا ہے اور بالکل فی سبیل اللہ۔ اس عمر میں اتنی خدا خوفی کم کم ہی ہوتی ہے۔"

نور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی...... اور دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں بسمہ، مہرین اور دیگر کزن موجود تھے۔

رات کو ایک بار پھر پھپھو کا فقرہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا...... ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا......

"ہوں۔" اس نے سر کو بیزاری سے حرکت دی اور کروٹ بدل لی۔

بے شک ذوالقرنین کی ایک بات نور کو اچھی لگی تھی کہ اس نے ایک موقع پر فرہاد کو نور کے ساتھ کار میں دیکھنے کے باوجود، یہ بات اپنے تک محدود رکھی تھی۔ اس نے بعد میں بھی اپنے گھر میں یا نور کے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا (حالانکہ ایک موقع پر نور کو ڈر پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسے بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرے) لیکن جہاں تک ذوالقرنین کے لیے پسندیدگی کا تعلق تھا، یہ سوال خارج از نصاب تھا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے نور کے دل و دماغ میں جو آئیڈیل تھا، وہ بالکل اور طرح کا تھا۔ نرم مزاج، خوش گفتار، خوش لباس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوی پر بے جا پابندیاں عائد نہ کرنے والا۔ اس کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے والا۔ بے شک مذہبی لیکن روشن خیال۔

وہ سوچنے لگی، کہیں نہ کہیں تو کوئی ہوگا جو اس کے لیے ہوگا۔ جو اس کے مطابق ہوگا۔ اسے اس کی ساری بشری خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ چاہے گا۔

☆☆☆

عید گزر چکی تھی۔ ذوالقرنین کی روزمرہ مصروفیات پھر شروع ہو چکی تھیں۔ عصر تک اپنی کتابوں کی دکان پر رہنے کے بعد وہ قریبی مسجد میں چلا جاتا تھا اور بچوں کو تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کے لیے پھر دکان پر جانا ہوتا تھا لیکن آج چونکہ بارش ہو رہی تھی، اس لیے وہ جلدی گھر آ گیا۔ شیروانی اتار کر ہینگر پر لٹکائی۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی، اپنی چھوٹی ہموار ڈاڑھی سے بارش کے قطرے جھاڑے اور تھکا تھکا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

سہانا موسم ہر کسی پر اثر کرتا ہے۔ دل میں کچھ شگوفے سے پھوٹتے ہیں، چاہے وہ دل کسی کا بھی ہو۔ مولانا حبیب اللہ کے بیٹے قاری ذوالقرنین کا بھی ہو۔ ہاں اپنی تمام تر شرافت، نجابت اور حیاداری کے باوجود اس کا دل دھڑکتا تھا، اس کی رگوں میں خون کی یورش ہوتی تھی۔ اس نے بارہا خود کو سمجھایا تھا...... وہ اسے بھول کیوں نہیں پاتا۔ وہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نہیں ہے، وہ کیوں اپنی زندگی کو ایک مسلسل ناہمواری کے حوالے کرنا چاہتا ہے لیکن وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے اسے پہلی بار شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ عورتوں والے پورشن میں تھی اور اپنا اسکارف کھول کر باندھ رہی تھی۔ بس ایک جھلک سی تھی، دلکش چہرے کی، لمبے شہد رنگ بالوں کی اور شربتی آنکھوں کی۔ وہ جھلک قاری ذوالقرنین کے اندر گہرائی تک پیوست ہو گئی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ "بھائی! آج تم جلدی آ گئے؟"

"بس، بارش ہو رہی تھی، ایسے موسم میں گاہک وغیرہ کہاں آتا ہے۔"

"امی آج بھی کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکی دیکھنے جانا ہے......"

"خدیجہ! کہا بھی ہے کہ ابھی تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔"

"ایسا کیوں ہے بھائی، تم تو خود ای سے کہا کرتے تھے کہ...... شادی بیاہ میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے اور اب دیر پر دیر کیے جا رہے ہو۔"

"دراصل...... میں اپنے دل کو ذرا ٹھکانے پر لانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے پتا ہے، وہ ٹھکانے پر کیوں نہیں ہے۔" خدیجہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

شروع میں ذوالقرنین نے نور کے حوالے سے اپنے سارے احساسات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے تھے۔ یہ کوئی ناجائز احساسات نہیں تھے مگر ذوالقرنین نے خود کو جس خول میں چھپا رکھا تھا، وہ اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ایک نہایت دین دار نوجوان کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ اصلاح معاشرہ نامی تنظیم کا ایک سرگرم رکن تھا۔ لوگ اس کی شرافت کی مثالیں دیتے تھے۔ اب عالم دین مولانا حبیب اللہ کا یہ بیٹا کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ذوالقرنین کے نزدیک یہ بہت معیوب صورت حال تھی۔ اس نے اپنی سوچوں کو سات پردوں میں لپیٹ کر سات تہ خانوں کی گہرائی میں دھکیل دیا تھا۔ صرف...... اور صرف خدیجہ ایسی تھی جو ان تہ خانوں کی گہرائی میں سے کچھ ڈھونڈ لائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کسی شدید ذہنی کوفت کا

شکار ہے۔ وہ نور کے حوالے سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی تھی کیونکہ وہ بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھی (اب کچھ عرصے سے اس نے بھائی کے اصرار پر کالج میں اصلاح معاشرہ تنظیم کی داغ بیل بھی ڈالی تھی) اسے کالج میں نور کے بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی تو بھائی سے شیئر کرتی۔

خدیجہ بولی۔ ''ذوالقرنین! مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی ڈگر سے ہٹنے والی ہے۔ عید کے موقع پر وہ واپس اپنے والد اشفاق صاحب کے گھر چلی گئی تھی۔ معافی وغیرہ بھی مانگی ہوگی اس نے..... مگر اب پھر تایا کے گھر میں ہے..... اور وہ بھاگ دوڑ والی روٹین بھی جاری ہے۔ پتا نہیں وہ کیا نکالنا چاہتی ہے اس میں سے.....؟''

''اپنے والد سے صلح ہوئی اس کی؟'' ذوالقرنین نے پوچھا۔

''کھل کر صلح تو نہیں ہوئی، ورنہ وہ واپس تایا کے پاس کیوں جاتی۔ شاید اتنا ہوا ہے کہ اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ شاید اس نے کچھ مہلت وغیرہ مانگی ہو۔ کسی وقت مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔''

''مہلت کس لیے چاہتی ہے۔ وہی بھاگ دوڑ ہی ہے نا اور اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی ہے۔''

''یہ جو کھلاڑی اور فن کار وغیرہ ہوتے ہیں ذوالقرنین! ان کے ذہن میں ایک بار جو کیڑا گھس جائے وہ آسانی سے نہیں نکلتا۔ خود کو خراب کر رہی ہے۔ اتنی پیاری ہے، اتنے اچھے گھر سے ہے مگر خود کو مصیبتوں میں پھنسا رہی ہے۔ مولوی اشفاق کے لیے یہ کتنی شرمندگی کی بات ہوگی کہ ان کی بیٹی اس طرح کے کاموں میں پڑی ہوئی ہے۔''

''ایسے بندے کو اللہ ہی ہدایت دیتا ہے۔''

''لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے کے بعد ہدایت پائے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے کالج میں سنا تھا کہ گوجرانوالہ کی ''چیمپئن ایتھلیٹ'' نشو بجلی کے ساتھ نور کا زبردست ٹاکرا چل رہا ہے۔ وہ لوگ کسی صورت نور کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ جہاں کہیں کوئی ایونٹ ہوتا ہے اور یہ دونوں اکٹھی ہوتی ہیں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔''

''بس یہی معاملے ہیں نا خدیجہ جن کی وجہ سے عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے کو احسن سمجھا جاتا ہے۔ باہر کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو بنایا ہے اور وہی اس کے لیے بہتر ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تم خود بھی تو اس سے ملتی ہو نا؟''

''ہاں۔ کبھی کبھی، عام سے انداز میں۔''

''اسے شک تو نہیں ہوا کہ تم کون ہو؟''

''نہیں۔ اس نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کہیں دیکھا بھی ہوگا تو بھول چکی ہے۔''

بہن سے گفتگو کے بعد بھی ذوالقرنین دیر تک جاگتا رہا۔ کھڑکیوں سے بارش کی پھواریں ٹکرا رہی تھیں اور دل میں جلترنگ کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ نور کی آواز، اس کی آنکھوں کے رنگ، اس کا دلنشیں لب ولہجہ اور پھر خفگی کے عالم میں پیشانی کی ایک چھوٹی سی سلوٹ...... سب کچھ اس کے تصور میں گھوم رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کا دل چاہا کہ وہ کم از کم ایک بار نور سے پھر ملاقات کرے اور اسے اس ''سعئی لاحاصل'' سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اسے سمجھائے کہ اس کی جدوجہد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔

☆☆☆

نور آہستہ آہستہ شکست کے بعد صدمے سے نکل رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی ''ایف اے ایس'' سے واپس آئی تھی اور تھکی ہاری سی بستر پر دراز تھی۔ ذرا ستانے کے بعد وہ مغرب کی نماز پڑھنا چاہ رہی تھی۔ اسی دوران میں تایا ابا اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''گاؤں چلنا ہے؟''

''گاؤں؟''

''بھئی، بھول گئی ہو تم۔ امنالے کا میلا آگیا ہے۔ تمہاری دادی تو ایک مہینے سے تیاریوں میں لگی ہیں۔ پچھلی دفعہ وہ لوگ اکیلے چلے گئے تھے مگر میرا خیال ہے اس دفعہ ہمیں ضرور جانا چاہیے۔''

امنالے کا میلا یعنی پیر امناں والے کا میلا...... اس میلے کا ذکر ہی اپنے ساتھ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادیں لے آتا تھا۔ دل میں ایک ترنگ سی جاگتی تھی لیکن آج کل نور کا تربیتی شیڈول بھی ٹائٹ چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کتنے دن رکنا ہوگا تایا ابا؟''

''کم از کم پانچ دن لیکن تم ضرور جاؤ۔ ایک تو تمہارا موڈ بہتر ہوگا۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس نامعقول کے آس پاس رہنے کا موقع ملے اور اس کے دل میں مزید نرمی پیدا ہو۔'' نامعقول سے تایا ابا کی مراد ہمیشہ کی طرح نور کے ابا جی ہی تھے۔

وہ بچنا چاہتی بھی مگر دل بھی چاہ رہا تھا۔ آخر وہ آمادہ ہوگئی۔ ٹریننگ سینٹر یعنی ''ایف اے ایس'' سے پانچ چھ دن کی چھٹی اس شرط پر مل گئی کہ وہ اسٹریچنگ وغیرہ کی ورزشیں

جاری رکھے گی اور ڈائٹ کے حوالے سے بھی پوری پابندی کرے گی۔ بسمہ اور نور دوسرے دن بازار گئیں تا کہ رداگی کے حوالے سے کچھ شاپنگ کر سکیں۔ شاپنگ کرتے ہوئے بسمہ ذرا تھک گئی تو وہ دونوں ایک جوس کارنر میں داخل ہوگئیں۔ ابھی انہیں میز پر بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ نور نے دیکھا کسی شخص نے بسمہ کو مخاطب کیا ہے۔ ''بسمہ بہن! کیا میں دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

بسمہ اور نور نے ایک ساتھ اس شخص کی طرف دیکھا۔ نور بے طرح چونک گئی۔ وہ ذوالقرنین تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ سر پر چمکیلے حاشیے والی گول ٹوپی تھی۔

بسمہ اور نور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نور نے غصے سے کہا۔

''پلیز ...... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف ......صرف دو چار منٹ۔''

نور کا دل چاہا کہ وہ اپنی کرسی کو پیچھے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہو مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنا حجاب درست کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ ہمارا پیچھا کر رہے تھے؟''

''میں شرمندہ ہوں لیکن خدا گواہ ہے، میں کسی بری نیت سے یہاں موجود نہیں ہوں۔ صرف آپ کی بھلائی کی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ حسب عادت نظریں جھکائے جھکائے بولا۔ پچھلی ملاقات کی نسبت آج اس کا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

''معاف کیجیے۔ ہم نابالغ نہیں ہیں۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہیں۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ آپ سب کچھ سمجھنے کے باوجود سمجھ نہیں پا رہیں۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ ایک ایسے راستے پر چل رہی ہیں جہاں آپ اور آپ کے نہایت نیک نام والد صاحب کے لیے بہت سی پریشانیاں ہیں۔''

''آپ کس حوالے سے مجھے لیکچر دے رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی ناسمجھ جاہل ہوں؟''

''ایسا ہوتا تو پھر اتنے دکھ کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا نہیں ہے اور اس کے باوجود آپ گمراہی کی طرف جا رہی ہیں۔''

''جسے آپ گمراہی فرما رہے ہیں، وہ ہمارے نزدیک نہیں ہے اور یہ بحث اتنی طویل ہے کہ...... آپ کے بال سفید ہو جائیں گے۔'' نور نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بسمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ذوالقرنین کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا مگر وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔

نور اور بسمہ نے باقی شاپنگ ادھوری چھوڑ دی۔ موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ نور بڑبڑا رہی تھی۔ ''پتا نہیں کہاں سے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اب اگر یہ سامنے آیا تو منہ توڑ جواب ملے گا اسے۔''

اگلے روز دادی اور پھپھو کی فیملی کے ساتھ ساتھ دونوں بھائیوں کی فیملیاں، تین گاڑیوں پر سوار گاؤں روانہ ہو رہی تھیں۔ ماموؤں کو ایک روز بعد آنا تھا۔ بہت عرصے بعد نور کو لاہور سے باہر نکلنے اور اپنی مصروفیات کو بریک لگانے کا ایک موقع مل رہا تھا۔ وہ تایا جان والی گاڑی میں سوار ہوتی لیکن وہاں دادی بیٹھی ہوئی تھیں اور نور کو معلوم تھا کہ وہ پورے راستے میں اس کی والدہ مرحومہ کو نشانے پر لیے رکھیں گی اور نور کو مادر پدر آزاد قرار دے کر اس کے لتے لیں گی۔ وہ اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں پھپھو اور کزن موجود تھے۔

گجرات سے آگے تنگ سڑک پر ایک گھنٹے کا سفر تھا اور کچے پکے راستے پر تقریباً دو گھنٹے کا نہایت دشوار سفر طے کرنے کے بعد وہ بالآخر موراں والی گاؤں پہنچ گئے۔ (بسمہ کے رشتے والا معاملہ حل ہو چکا تھا۔ ایک ایم این اے ضامن تھا۔ اب اس حوالے سے انہیں کھاری برادری کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ چودھری طغرل کی والدہ وڈی اماں آج کل بیمار تھی اور نور کی دادی اس کی خبر گیری بھی کرنا چاہتی تھیں۔)

موراں والی میں وہ بڑے پُرلطف دن ثابت ہوئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میلے کی قدیم روایت کے مطابق تین دن پہلے علاقے کے لوگوں نے رضا کارانہ طور پر ہر طرح کا آتشیں اسلحہ تھانے میں جمع کرا دیا تھا لیکن یہ اسلحہ تھانے میں جمع نہیں ہوتا تھا۔ رسم کے مطابق بلند و بالا مزار کے سامنے سات آٹھ بڑی چارپائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ ان پر سفید چادریں بچھائی جاتی تھیں اور لوگ اپنے اپنے ہتھیار لا کر یہاں رکھتے جاتے تھے اور تھانے کے محرر سے ٹوکن لیتے جاتے تھے۔ ایک ٹوکن ہتھیار یا ہتھیاروں کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس میں ناجائز اسلحہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس اسلحے کے لیے بالکل علیحدہ طریقہ کار تھا...... یہ اسلحہ لوگ رات کی تاریکی میں جمع کراتے تھے۔ جو ضروری سمجھتے، وہ اپنا منہ سر بھی ڈھانپ لیتے تھے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں مستطیل شکل کی ایک طویل کوٹھڑی تھی۔ نانک

چندی اینٹوں کی بنی ہوئی اس قدیم کوٹھری کی موٹی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے بہت سے خانے بنائے گئے تھے۔ ان خانوں پر لوہے کے قریباً ایک مربع فٹ کے ڈھکنے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ ہر خانے کا نمبر تھا۔ اپنے غیر لائسنسی ہتھیار لوگ ان خانوں میں رکھتے اور چابی اپنے پاس محفوظ کرلیتے۔ میلے کے اختتام پر رات کے وقت یہ لوگ اپنے ہتھیار نکال کر لے جاتے تھے۔ مدتوں گزرنے کے باوجود اس معاملے میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے ہی ہتھیار لے کر جاتا تھا اور اگر پولیس کو ناجائز اسلحے کے مالک کی کچھ خبر ہو بھی جاتی تھی تو مطلق بازپرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہ سب اس میلے کی بے مثال اور انوکھی روایات تھیں یعنی غیر قانونی کام بھی بے حد ایمانداری کے ساتھ۔ اس حوالے سے لوگوں کے عقیدے اتنے پختہ تھے کہ کوئی انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میلے کے سات روز میں علاقے میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ چوری، رسّا گیری اور جیب تراشی کی چھوٹی موٹی وارداتیں بھی ناپید ہوجاتی تھیں۔ یہ تھا امناں والے کا میلا۔

نور اور فیملی کے دیگر بچوں بڑوں نے اپنی ساری سنہری یادیں تازہ کیں۔ آبائی مکان کا بڑا حصہ اور ملحقہ باغ تو بک چکے تھے مگر دریا کی طرف پرانی حویلی اب بھی دونوں فیملیز کی ملکیت تھی اور وہ یہاں بھرپور تفریح کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی بڑی اچھی کھلاڑی نکلی ہے اور اخباروں وغیرہ میں اس کا ذکر آتا ہے کئی عورتیں اور لڑکیاں اس سے ملنے کے لیے آئیں۔ کچھ آنکھوں میں واقعی ستائش تھی مگر کچھ کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اور بیگانگی کی جھلک تھی، جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں...... تم ہمارے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکیوں کو کیا راستہ دکھا رہی ہو۔ مولوی اشفاق کی بیٹی ہو کر تم کس راستے پر چل رہی ہو۔ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جوانی سنبھالو، اپنا گھر سنبھالو، بال بچے دار بنو، کڑیوں کے یہ کام نہیں ہوتے۔

میلے میں ایک دن صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز نور، بسمہ، مہرین اور فیملی کی دیگر لڑکیاں بھی گئیں اور خوب تفریح کی۔ ہاں نور کو کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ صرف دو ہفتے بعد اسے ایک اہم ایونٹ میں حصہ لینا تھا اور اس میں نشو بھی آ رہی تھی۔

گاؤں میں قیام کے دوران نور نے اباجی کی دلجوئی کی کافی کوشش کی۔ ان کی خدمت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی مگر ان کا رویہ بدستور کھچاؤ کا رہا۔ تایا جان کے سامنے وہ بول تو نہیں سکتے تھے مگر دونوں بھائیوں میں پہلی والی گرمجوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نور خود کو اس کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

گاؤں سے واپس آ کر نور پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں لگ گئی۔ پانچ چھ روز کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے اضافی محنت کی۔ ایتھلیٹکس کا یہ ایونٹ دراصل واپڈا میں ملازمت کے حوالے سے تھا۔ صوبے کی چار پانچ ٹاپ رنرز بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ نور نے سو میٹر کے ٹرائلز میں سخت جدوجہد کی۔ فائنل ہیٹ میں اس نے اپنی اہم ترین حریف نشو بیگی کو 0.75 سیکنڈ کے ساتھ شکست دی (حالانکہ مبینہ طور پر نشو کو ایک غیر ملکی کوچ کی خدمات بھی حاصل تھیں اور وہ نیشنل گیمز میں ٹائٹل مقابلہ بھی جیت چکی تھی)۔

اس فتح کے بعد نور کو قوی امید ہوگئی کہ وہ اگلے قومی مقابلوں میں بھی نشو کو پچھاڑ سکے گی۔ اس ایونٹ کی فتح سے نور کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایک مناسب جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ تایا جان پر اس کے اخراجات کا جو اضافی بوجھ پڑ رہا تھا وہ کم ہوگیا۔ مثلاً اگر پہلے اس پر 30 ہزار ماہانہ خرچ ہو رہا تھا تو اب یہ شرح چودہ پندرہ ہزار رہ گئی۔ تنخواہ کے علاوہ نور کو کچھ مراعات بھی مل رہی تھیں۔

نور کو خدشہ تھا کہ شاید ذوالقرنین پھر اس کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری دل جمعی سے میگا ایونٹ یعنی نیشنل گیمز کی تیاری میں لگی رہی۔ اس نے تایا جان کے کہے کو اپنا "موٹو" بنا لیا تھا۔ محنت اور مسلسل محنت، اس یقین کے ساتھ کہ صلہ مل کر رہے گا۔ سخت تربیت اور رننگ کے دوران میں بھی وہ کئی بار یہ جملہ زیر لب دہرانے لگی تھی...... "مسلسل محنت کا صلہ مل کر رہتا ہے۔"

اس کی ٹائمنگ اب کسی وقت 11.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی۔ اس کا اور اس کے کوچز کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ گولڈ میڈل یا کم از کم سلور میڈل تک پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

میگا ایونٹ نیشنل گیمز میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ نور کا اوڑھنا بچھونا اس کی ٹریننگ بنی ہوئی تھی۔ وہ کہیں آنے جانے میں بھی بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی تایا یا ماموں کے ساتھ کہیں موٹر بائک پر بھی چلی جاتی تھی مگر اب تایا ابا کا حکم تھا کہ وہ صرف گاڑی استعمال کرے گی۔ ایسے موقعوں پر چوٹ لگ جانا یا کسی طرح اَن فٹ ہوجانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

وزارتِ کھیل کی طرف سے صوبائی سطح پر کوئی ٹیلنٹ ہنٹ اسکیم ہو رہی تھی۔ انڈر 16 کی لڑکیوں میں سے قابل جوہر تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ ٹرائلز نور کے کالج کے وسیع و عریض میدان میں ہونا تھے۔ انتظامیہ نے نور کو بھی سینئر ایتھلیٹ کی حیثیت سے دعوت نامہ جاری کیا ہوا تھا۔

وہ ایونٹ کے روز کالج پہنچی تو وہاں رش لگا ہوا تھا۔ شامیانوں کے نیچے مختلف شہروں سے آنے والی بے شمار چھوٹی لڑکیاں موجود تھیں۔ نور پر انکشاف ہوا کہ نشو بجلی بھی آئی ہوئی ہے۔ نشو کی موجودگی اسے ہمیشہ ناگوار ہی گزرتی تھی اگر اسے پتا ہوتا کہ اس نے بھی آنا ہے تو شاید وہ نہ آتی۔

نور کے ساتھ بسمہ اور مہرین بھی آئی ہوئی تھیں۔ بسمہ حسب معمول برقعے میں تھی۔ تقریب میں ایک موقع پر وہی ہوا جس کا نور کو خدشہ تھا۔ نشو کی سپورٹرز نے ہلڑ بازی شروع کردی۔ بسمہ کو ”ڈاکو“ کہا گیا۔ (کیونکہ اس نے برقع پہن رکھا تھا) نور کو دیکھ کر ”پینڈو...... پینڈو“ کے نعرے لگائے گئے...... اور بات صرف ہوٹنگ تک ہی نہیں رہی۔ ہجوم میں سے کسی لڑکی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور نور کا اسکارف کھینچ کر اتار دیا۔ یہ بدتمیزی مہرین سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا اور اس کے بال کھینچے۔ ان لوگوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا۔ ایک دم لڑائی شروع ہوگئی۔ کئی لڑکیاں مہرین اور بسمہ پر پل پڑیں۔ بسمہ کا برقع پھٹ گیا، وہ گرگئی۔ بسمہ اپنی چھوٹی بہن کے برعکس بالکل دھیمے مزاج اور دبلے جسم کی تھی، ٹھیک سے دفاع بھی نہ کرسکی۔ اپنی بڑی بہن کو یوں بے بس دیکھ کر نور تماشائی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں سے بھڑ گئی۔ نشو چلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ نور نے اسے گھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ اسی دوران میں ایک ہٹی کٹی لڑکی کے ہاتھ میں کسی ٹوٹی ہوئی کرسی کا پایہ آگیا تھا۔ وہ نور پر جھپٹی اور تاک کر اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ مضبوط لکڑی کے پائے کی دو تین شدید ضربیں نور کو لگیں۔ نشو کی حمایتیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ صاف محسوس ہوا کہ انہوں نے یہ سب پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔

یہی موقع تھا جب نور نے خدیجہ کو دیکھا۔ اس کا گلابی اسکارف تیزی سے قریب آرہا تھا۔ وہ اصلاح معاشرہ کے فیمیل ونگ کی جنرل سیکریٹری تھی۔ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ وہ حملہ آور لڑکیوں پر جھپٹی۔ ایک دو منٹ کے لیے ٹھیک ٹھاک مارا ماری ہوئی۔ کئی لڑکیوں کو چوٹیں آئیں پھر نشو کی سپورٹرز پسپا ہوگئیں۔ کالج کی انتظامیہ اور گارڈز وغیرہ بھی آگئے اور دونوں گروپوں کو ایک دوسرے سے دور کردیا۔

نور کو سب سے پہلے اپنی ٹانگ کی فکر ہوئی۔ اس نے ٹانگ پر وزن ڈالا اور پھر چل پھر کر دیکھا۔ چوٹ ابھی گرم تھی...... اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ بہرحال گھٹنے کے پاس ایک بڑا نیل نمودار ہوچکا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا خون بھی رِس رہا تھا۔ اس نیل کی موجودگی ظاہر کررہی تھی کہ ہنگامے میں جان بوجھ کر نور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس واقعے پر میڈم فرحانہ اور ڈیپارٹمنٹ کے اسپورٹس ہیڈ نے شدید ردعمل ظاہر کیا...... نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی کی پوائنٹ آؤٹ ہوگئی تھی۔ نور کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نشو اور اس لڑکی کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائی جائے مگر پھر فونز کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں۔ گوجرانوالہ سے دو تین بااثر افراد کی کالیں بھی آگئیں۔ مختلف ذریعوں سے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو بھی اپروچ کرلیا گیا۔ اندازہ ہوا کہ معاملہ صلح صفائی پر ختم ہوگا۔ ویسے بھی نور کسی شدید چوٹ سے بچ گئی تھی۔ میڈم فرحانہ اسے اپنے ساتھ لے کر آرتھوپیڈک اسپتال پہنچیں۔ اس کی ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ کیے گئے اور تسلی ہونے کے بعد اسے ضروری ٹریٹ منٹ بھی دی گئی۔ ڈاکٹرز نے اسے تین چار روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

بظاہر سب ٹھیک ہوگیا تھا مگر چار پانچ روز آرام کے بعد جب نور ٹریک پر پہنچی اور اس نے باقاعدہ رننگ شروع کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا اب تک نظر آیا ہے۔ اس کا متاثرہ گھٹنا پوری طرح کام نہیں کررہا تھا۔ یہ وہی گھٹنا تھا جس پر شروع شروع میں کھچاؤ محسوس ہوا کرتا تھا مگر بہترین فزیکل ٹریننگ سے یہ کھچاؤ ختم ہوگیا تھا۔ اب اس سخت چوٹ نے اس کھچاؤ کو دوبارہ نمودار کردیا تھا۔

یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ چار پانچ روز تک تو نور نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ امید پالی تھی کہ شاید دوڑنے سے اور روٹین میں آنے سے گھٹنے کی حالت بھی معمول پر آجائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ تکلیف میں کمی کے بجائے اضافے کا احساس ہوا...... وہ اس صورت حال کو مزید راز نہ رکھ سکی۔ ڈیپارٹمنٹ کی کوچ اور منیجر وغیرہ بھی آگاہ ہوگئے۔ ایک بار پھر اس کی چوٹ اور ”ٹریٹ منٹ“ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر کا اندیشہ تو ”سی ٹی اسکین“ وغیرہ سے دور ہوگیا مگر ایک دو مسل متاثر تھے...... تفصیلی معائنے کے بعد محکمے کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”مس نور! آپ کو کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرنا پڑے گا۔“

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن ڈاکٹر! دو ہفتے آرام کے بعد تو صرف تین ہفتے بچیں گے۔ میں اتنی جلدی فارم کیسے حاصل کر پاؤں گی؟''

''تو پھر آپ ...... میرا مشورہ مانیں۔ ان مقابلوں سے دستبردار ہو جائیں۔ جلد بازی کر کے آپ اپنے کیریئر کو خطرے میں ڈال دیں گی۔''

یہ الفاظ برق کی طرح نور کے حواس پر گرے۔ ''نہیں...... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ دل ہی دل میں پکار کر بولی۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے...... ''مس نورا! ابھی آپ کی عمر بائیس سال ہے۔ آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آئندہ سال قومی ایونٹ میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ بہتر کارکردگی دکھا سکیں۔''

''اوہ نو۔'' اس نے کرب کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ وہ تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب ایک سال کی بات کر رہے تھے۔

میڈم فرحانہ بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اس کی باڈی میں ریکوری کی زبردست صلاحیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس بارہ روز کے مزید آرام سے یہ فٹ ہو جائے گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے امکان نظر نہیں آ رہا۔ ویسے میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو اس لڑکی کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ نور کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔''

''وہ بڑے با اثر لوگ ہیں۔'' فرحانہ بیگ نے کہا۔ ''کیس ہوا تو پھر کیسوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آپ کا ڈیپارٹمنٹ بھی اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ''میں نے اس واقعے کی ویڈیو دیکھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر وہ دوسرے گروپ کی لڑکیاں مدد کو نہ آ جاتیں تو نورا اور اس کی چار پانچ ساتھیوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔''

''جی ہاں۔ وہ ہمارے کالج کی ہی ایک آرگنائزیشن کی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے بڑا بروقت قدم اٹھایا۔''

نور نے ابھی تک تایا جان اور بسمہ وغیرہ کو اپنی ہولناک افتاد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تاہم مہرین کو کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گھٹنے کی اندرونی سائیڈ پر لگنے والی چوٹ کتنی مضر ہوتی ہے۔ وہ بہت فکر مند تھی۔ اس روز ڈاکٹر سے مل کر جب نور گھر پہنچی تو کافی افسردہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تایا جان کو اس خبر سے کیسے آگاہ کرے۔ دوسری طرف اسے یہ امید بھی تھی کہ وہ چند روز کے آرام کے بعد دوبارہ ٹریک پر آ جائے گی۔

گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ دراصل اسے نور نے ہی بے حد ''ریکوئسٹ'' کر کے بلایا تھا۔ یہ وہی لڑکی خدیجہ تھی جس نے ہنگامے کے روز ڈٹ کر نور اور اس کی فرینڈز کی مدد کی تھی۔ وہ ''عبایا'' میں تھی اور تائی جان اور مہرین کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

نورا سے دیکھ کر گرمجوشی سے گلے ملی۔ ''سوری خدیجہ! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ وہاں ٹریننگ سینٹر میں ایک لیکچر سننا پڑ گیا تھا۔'' نور نے ڈاکٹر اور ہاسپٹل والی بات گول کی۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ کی تائی جان اور مہرین سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں آپ کی بہن سے بھی ملنا چاہتی تھی مگر وہ شاید دوسرے گھر میں ہیں۔'' نور نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''ان کو بھی تو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ سارا برقع بھی پھٹ گیا تھا ان کا۔''

''ہاں، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''اور آپ؟''

''آپ کی مہربانی سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ سے ملاقات تو پہلے بھی ہوتی رہتی تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ ایک دن آپ اس طرح ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوں گی۔''

''نہیں بھئی نورا! آپ تو ہمارے کالج کا بلکہ پورے شہر کا ایک روشن نام ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید ترقی دے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ اب پھر روٹین کی ٹریننگ کر رہی ہیں۔''

نور کو سینے میں غم کی لہر سی محسوس ہوئی۔ خدیجہ اور نور کے درمیان بیس تیس منٹ تک گفتگو کا دور چلا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں ہی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں۔ جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ خدیجہ، نور سے قریباً دو سال سینئر تھی۔ وہ اب نور کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور نور کو یہ اچھا لگ رہا تھا۔

خدیجہ نے کہا۔ ''اب ہم اس گروپ کی طرف سے پوری طرح الرٹ ہو گئے ہیں۔ ان ''پرکٹی'' شتونگڑیوں نے کسی بھی موقع پر گڑبڑ کی تو منہ توڑ جواب ملے گا۔ انشاءاللہ۔''

اچانک نور کو خیال آیا۔ "خدیجہ! آپ آئی کیسے ہیں؟"

"بھائی ساتھ ہے۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی۔ انہیں باہر بٹھا دیا ہے۔" تائی جان بولیں۔ "کہا بھی تھا اسے اندر لے آؤ لیکن مانی نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ وہ ذرا...... تنہائی پسند ہے۔"

خدیجہ ہنسی۔ "تنہائی پسند بھی...... اور آج اس کا روزہ بھی ہے، کچھ کھائے پیے گا نہیں۔"

"لیکن خدیجہ! انہیں ڈرائنگ روم میں تو بٹھا دیتیں۔" نور نے کہا۔

"چلیں، پھر سہی...... اس وقت تو کافی دیر ہو گئی ہے۔" وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب آپ لوگ اجازت دیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔" وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

نور اور مہرین اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔ ان کی ایف ایکس گاڑی پندرہ بیس قدم دور کھڑی تھی۔ گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ نجانے کیوں یہ نیلی گاڑی نور کو جانی پہچانی سی لگی...... جب خدیجہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو نور کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ ذوالقرنین تھا قاری ذوالقرنین۔ تو کیا خدیجہ، ذوالقرنین کی بہن تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے نور کے رشتے کی بات چلی تھی؟ وہ کافی دیر تک اس غیر متوقع اتفاق کے حوالے سے سوچتی رہی۔ کہیں خدیجہ کی یہاں آمد کے پیچھے بھی تو کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی؟

اپنی چوٹ کے بارے میں نور کے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا مگر وہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر امید کو روشن رکھے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ چند دن کے مکمل آرام سے وہ نارمل ہو جائے گی۔ گاہے گاہے نشو بجلی اور اس کے گروپ کے حوالے سے بھی اس کے اندر شدید غم و غصہ نمودار ہوتا تھا مگر اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ان لوگوں سے لڑائی مول لینا آسان نہیں ہے۔

اس نے بند کمرے میں ہلکی پھلکی ورزش کر کے اپنی چوٹ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ اسے گھٹنے میں تیز درد شروع ہو گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ تایا ابا تھے۔ انہیں ابھی تک نور کی فٹنس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ یہ اسپیشل ایتھلیٹ شوز تھے جو انہوں نے یو ایس اے سے منگوائے تھے۔

"لو بھئی! تمہارا یہ کام بھی ہو گیا۔" وہ اسے پیکٹ تھماتے ہوئے دبے دبے جوش سے بولے۔

پھر ان کی نگاہ نور کے چہرے پر پڑی اور وہ ذرا ٹھٹکے۔ "خیریت تو ہے نوری؟" انہوں نے پوچھا۔

"بس یونہی...... سر میں تھوڑا سا درد تھا۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"تو آرام کرو نا بیٹی! آج کل تو تمہاری پریکٹس بھی نہیں ہے۔"

"جی تایا ابا۔" اس نے اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

تایا ابا کو دکھانے کے لیے اس نے پیکٹ کھولا۔ شوز پہن کر بھی دیکھے، تعریف بھی کی اور شکریہ بھی ادا کیا لیکن اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، وہی جانتی تھی۔

تایا ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نور! تمہیں پتا ہے چاند پر پہلا شخص کون پہنچا تھا؟"

"جی...... نیل آرمسٹرانگ۔" وہ ہولے سے بولی۔

"اور دوسرا؟"

"دوسرے کا نام...... نہیں...... دوسرے کا نام یاد نہیں۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اپنے لیے ہمیشہ نمبر ون کو ذہن میں رکھو۔" اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

وہ دروازہ بند کر کے جیسے سسک اٹھی۔

☆☆☆

ایونٹ سے چھ سات دن پہلے تایا ابا کو بھی پتا چل گیا تھا کہ نور پوری طرح فٹ نہیں ہے لیکن پوری طرح پر عزم ہے اور ہر صورت ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ محکمے کے سینئر ڈاکٹر کے علاوہ بھی ایک دو بہترین اسپیشلسٹ اسے زیر معائنہ رکھے ہوئے تھے۔ نور کوشش کے باوجود اپنی بہترین ٹائمنگ حاصل نہیں کر پا رہی تھی اور یہ اس کے لیے بے حد تکلیف دہ بات تھی لیکن ایک جنون تھا، ایک دیوانہ پن تھا، وہ ہر صورت میگا ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ ایک وجدان سا تھا اس کے اندر...... اس نے مسلسل محنت کی ہے۔ اپنی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اسے ضرور صلہ ملے گا...... مل کر رہے گا۔ یہی تو کہتے تھے تایا جان بھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن وہ اس مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئی جس کا انتظار وہ ایک عرصے سے کر رہی تھی......

وہ اپنی فٹنس کے حوالے سے مطمئن نہیں تھی مگر اپنی ہیڈ کوچ میڈم فرحانہ کو بتا بھی نہیں رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے اس حوالے سے میڈم فرحانہ سے تفصیلاً بات کی تو ہوسکتا ہے کہ معاملہ خراب ہوجائے۔ نتیجہ یہ نکلے کہ اسے ایونٹ میں حصہ لینے سے ہی روک دیا جائے۔ وہ فٹنس حاصل کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی اور ساتھ ساتھ شب و روز دعا گو بھی تھی۔

بالآخر فیصلے کا دن آن پہنچا۔ توقع کے عین مطابق ٹاپ کی پانچ چھ اسپرنٹرز آسانی سے فائنل تک پہنچ گئیں۔ ان میں نشو بجلی، نور اور ایچی سن کالج کی ارم بھی شامل تھیں۔ ہر کسی کو فائنل ریس کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔ اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمروں کی فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ٹی وی کیمرے اور عام ویڈیو کیمرے بھی چکراتے دکھائی دے رہے تھے۔ دل دھڑک رہے تھے اور سانسوں کے زیروبم میں تیزی آچکی تھی۔ اس کے کزن مہرین، شرجیل، عثمان وغیرہ بھی یہاں موجود تھے...... اور تایا جان کی موجودگی تو ہمیشہ لازمی ہوتی تھی۔ ہاں بسمہ اس دفعہ نہیں آسکی تھی لیکن یقیناً وہ بھی کہیں نہ کہیں ٹی وی کے سامنے موجود تھی۔

رنرز نے ٹریک پر پوزیشن لی۔ اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے۔ آگے جھک کر اسٹارٹنگ لائن کو چھوا اور فائر ہوتے ہی اپنے سپنوں کی تعبیر کی طرف دوڑے۔ ان لمحوں میں نور نے اپنے فٹنس کے پرابلم کو قطعی طور پر ذہن سے نکال باہر کیا تھا۔ بس ایک ہی بات اس کے ذہن میں تھی، اس نے جیتنا ہے اور ہر صورت جیتنا ہے۔ اس نے اپنی اس حریف کو نیچا دکھانا ہے جس نے اسے ہرانے کے لیے بدترین حربے اختیار کیے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ اس لڑکی سے قانونی طور پر نہیں لے سکتی تھی مگر کھیل کے میدان میں تو لے سکتی ہے اور وہ ضرور لے گی......
ایک دوسرا تصور جو اس کے حوصلے کو مہمیز کررہا تھا، وہ اس کے تایا ابا کا تصور تھا۔ انہوں نے بہت انتظار کیا تھا۔ آج وہ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتی تھی...... خوشی اور فتح کی چمک۔

وہ فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے دوڑی اور اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی توانائیاں صرف کردیں۔ وہ آغاز میں ہی دفاعی چیمپئن نشو سے تین چار فٹ آگے نکل گئی...... نشو نے چالیس میٹر طے کرنے کے بعد پورا زور لگایا اور نور کے برابر آگئی۔ وہ آج پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر آج نور نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنی لیڈ برقرار رکھے گی۔ تماشائیوں کے شور سے پورا اسٹیڈیم گونج رہا تھا...... اور پھر یکا یک زمین و آسمان نور کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ اس کے ایک گھٹنے میں ایسی شدید ٹیس اٹھی تھی جیسے کسی نے ٹانگ میں دہکا ہوا نیزہ اتار دیا ہو پھر شاید وہ ایک دو نہیں کئی پلٹیاں کھا گئی تھی۔ وہ فنش لائن سے پچیس تیس میٹر پہلے ہی گر چکی تھی۔ کئی سیکنڈ تک تو اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دل و دماغ یقین نہیں کر پا رہے تھے مگر نگاہوں کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ وہ اسپرنٹرز کو عقب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ فنش لائن پار کرچکی تھیں۔ نشو بجلی کے دونوں بازو بے ساختہ فضا میں اٹھ گئے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں اور اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا رہی تھی۔ بھاگتی چلی جارہی تھی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

نور اپنی جگہ پڑی رہی، وہ کیسے اٹھتی؟ مُردے بھی کہیں اٹھتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ مُردہ ہی تو تھی۔ انتظامیہ کے چند مرد و زن اس کی طرف لپکے۔ فی میل ورکرز نے اسے بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح تھی۔ وہیں ٹریک پر بیٹھی رہی۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ ان میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سر اپنے گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ وہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان لوگوں کو نگل لیتا ہے، یا زمین پھٹ جاتی ہے اور وہ اس میں سما جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی انہونی کی منتظر تھی۔ اس وقت جس منظر کی دید کا خوف اسے سب سے زیادہ ''ہانٹ'' کررہا تھا، وہ تایا جان کے ہلدی رنگ چہرے کا منظر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مزید مضبوطی سے بھینچ لیں۔

☆☆☆

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، محنت کا صلہ ملتا ہے۔ عمل پیہم رائگاں نہیں جاتا...... کہاں تھے ان محاوروں کے خالق، کیوں بنائے گئے یہ محاورے؟ کیوں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے امید کی شان میں قصیدے کہے اور اسے زندگی کی بقا کی بنیاد قرار دیا۔ وہ رات دن سوچتی تھی اور سوچتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کمرے میں بند ہوگئی تھی، نہ کسی سے مل رہی تھی، نہ کسی کی بات سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تین دن گزرنے کے باوجود تایا جان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا پھر مہرین

کی مدھم آواز ابھری۔ "دروازہ کھولو نور! یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں مروں گی بھوکی۔" وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ "بسکٹ ہیں اندر اور دودھ بھی ہے فریج میں۔ جاؤ تم۔ میں کھالوں گی۔"

"لیکن یہ کیا بیوقوفی ہے نور! تم تو تماشا بنا رہی ہو اپنے آپ کو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اپنے حواس ٹھکانے پر کرو۔ اگر گھٹنے کا مسئلہ زیادہ ہے تو اس کو بھی ٹریٹ منٹ کی فوری ضرورت ہے۔"

"نہیں...... ٹھیک ہے گھٹنا میرا۔" وہ لہجے کی تلخی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیکھو نور! تمہیں اباجان کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تا؟ لیکن وہ تو کل شام ہی چنیوٹ چلے گئے تھے۔" (اباجان سے مہرین کی مراد اپنے اباجان تھے)۔

"گھر میں اور کون ہے؟" نور نے مری مری آواز میں پوچھا۔

"بس میں اور امی۔ وہ بھی بازار گئی ہیں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد نور نے ایک لمبی سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ مہرین اندر آ گئی۔ نور جیسے سسک کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنسوؤں کے بغیر کیسے رویا جاسکتا ہے؟

"کوئی بات نہیں نور۔ ہر کام میں اللہ کی بہتری ہوتی ہے۔ تم نے کوشش تو پوری کی۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب جو اللہ کو منظور۔ کل اباجی بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔" وہ نور کو دلاسا دینے لگی۔

نور بالکل بجھ سی گئی تھی۔ کوئی دلاسا کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کہیں چلے جانا چاہتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے ہر ایک سے دور ہو جانا چاہتی تھی...... مگر کہاں جاتی؟

اچانک اس کی نگاہ خدیجہ پر پڑی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ یقیناً نور کو حوصلہ تسلی دینے کے لیے ہی آئی تھی۔ نور کے قدم جیسے بے ساختہ خدیجہ کی طرف اٹھ گئے۔ اس سے بات کر کے نور کو بہت اچھا لگا کرتا تھا مگر پھر یکایک وہ ٹھٹک سی گئی۔ اسے خدیجہ کے ساتھ اس گھر میں اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی تھی۔ خدیجہ کا بھائی اسی کے ساتھ آیا تھا اور وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ ذوالقرنین کا خیال آتے ہی نور کے اندر کچھ بجھ سا گیا۔ خدیجہ کے حوالے سے اس کی ساری چاہت ایک دم گہنا گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے خدیجہ کے پاس پہنچی اور عام سے انداز میں اس سے ملی۔

خدیجہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ نور کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کافی دیر سے یہاں مہرین کے پاس موجود تھی اور دونوں میں نور کی چوٹ وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی بات ہوتی رہی ہے۔ نور کو مہرین پر تھوڑا سا غصہ بھی آیا کہ اس نے کیوں خدیجہ سے اس معاملے پر بات کی مگر پھر یہ سوچ کر اسے اپنا غصہ ماند پڑتا محسوس ہوا کہ اس کی ہار کی وجہ اور اس کی چوٹ کے بارے میں تو اب ہر کسی کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا اور پھر جب سب کو معلوم ہو چکا ہے تو خدیجہ کو بھی سہی۔

رسمی کلمات کے بعد خدیجہ نے کہا۔ "میں کل کے اخبار میں تمہارے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رضوان کا مختصر انٹرویو تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تمہارے گھٹنے کی چوٹ سے آگاہ تھے اور انہوں نے تمہیں اور تمہاری ہیڈ کوچ کو مشورہ بھی دیا تھا کہ تمہارا اایونٹ میں حصہ نہ لینا بہتر ہے۔"

"لیکن میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کر سکتی ہوں مگر جو میری قسمت میں تھا۔"

"میں سمجھتی ہوں نور کہ جو تمہاری قسمت میں تھا وہ تمہیں نہیں ملنے دیا گیا اور اس کی قصوروار صرف اور صرف نشو ہے۔ وہ مدت سے تمہارے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور آخر اپنا کام دکھا گئی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ سارے ثبوت ہونے کے باوجود ہم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے...... اور اس لیے نہیں بگاڑ سکتے کہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں۔ کوئی باہر کا ملک ہوتا تو تمہارا کیریئر داؤ پر لگانے والی اس خبیث کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کر دیا جاتا۔"

"چھوڑیں خدیجہ! خود کو پریشان نہ کریں، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں یہ سب بھول جانا چاہتی ہوں۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر لہجے کی تہ میں جو غیر معمولی کرب تھا، وہ چھپائے نہیں چھپا تھا۔

خدیجہ نے جیسے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ایسے مت بولو نور! سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف ایک ایونٹ کی بات ہے، تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر رضوان نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ کا مکمل آرام تمہیں پھر سے فٹ کر سکتا ہے، اس کے علاوہ......"

"پلیز خدیجہ! آپ یہ ذکر نہ ہی کریں، مجھے اب گھبراہٹ ہوتے لگتی ہے۔ ویسے بھی میں کچھ دن کے لیے ذرا تنہائی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اب بھی...... سکون کی گولی کھائی ہوئی ہے...... تھوڑی دیر سونا چاہ رہی تھی۔" وہ کہتے کہتے کہہ ہی گئی۔

یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ زیادہ دیر خدیجہ کے

پاس بیٹھنا نہیں چاہتی۔ نور کی یہ بے رخی محسوس کرنے کے باوجود خدیجہ کی خندہ پیشانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا...... نم آنکھوں کے ساتھ اس کے سر کو چوما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا تم آرام کرو۔ اگر موڈ اچھا ہو اور کسی وقت بات کرنے کو دل چاہے تو فون ضرور کرنا۔''

☆☆☆

وہ کسی صورت اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس کا خیال تھا۔ شادی کی تقریب کا وہ منظر جیسے ذوالقرنین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا...... اس نے اپنا ڈھیلا اسکارف کھول کر پھر باندھا تھا۔ ستاروں کے درمیان جیسے ایک چاند چمکا تھا اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ کئی گھڑیاں ایسی ہی کایا پلٹ ہوتی ہیں۔ وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہیں۔ کہنے کو تو بس چند سیکنڈ لیکن جھیلنے کو ساری زندگی۔

تین دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ نور ایک بار پھر ٹائٹل جیتنے میں ناکام رہی ہے اور بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ آدھے راستے کے فوراً بعد ٹریک پر گر گئی تھی اور دور تک لڑھکی تھی۔ اس کی یہ تصویر کئی اخباروں میں چھپی تھی اور پی ٹی وی پر بھی یہ منظر دکھایا گیا تھا۔

ذوالقرنین کا دل غم سے بھرا ہوا تھا، اتنے میں اس کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ذوالقرنین کے کہنے پر ہی وہ نور سے ملنے گئی تھی۔

خدیجہ بالکل گم صم تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''وہ بہت خاموش ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں ذوالقرنین...... دانشوروں نے شاید درست ہی کہا ہے کہ ظلم کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے مگر ناانصافی کی نہیں۔ یہاں دو طرح کا انصاف ہے۔ ایک غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے، دوسرا امیر اور اثر رسوخ والوں کے لیے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''نور کی ناکامی کی وجہ وہی چوٹ ہے جو اس کمینی نشو نے اسے کالج والے ایونٹ میں لگوائی تھی۔ اس کا گھٹنا پوری طرح فٹ نہیں تھا پھر بھی اس نے ریس میں حصہ لیا اور شکست کھائی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ نشو کہیں میرے سامنے آئے اور میں اسے گولی مار دوں۔ سنا ہے آج کل وہ لاہور آئی ہوئی ہے، اس کے اعزاز میں تقریبات ہو رہی ہیں۔''

''اب کیا کہتی ہے نور...... کیا اب بھی اپنی ضد پر رہے گی؟''

''نہیں، اس بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یقین کرو ذوالقرنین! آج اسے دیکھ کر بڑا ترس آیا ہے مجھے۔ اپنے تایا اور والد کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے بڑی جان ماری تھی اس نے مگر......''

ذوالقرنین ذرا توقف سے بولا...... ''چلو تم اس سے ملتی رہو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی جیت نہیں ہے اور ایک ہی میدان نہیں ہے۔ بندہ ایک جگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کسی اور شعبے میں نام کما سکتا ہے۔''

''تمہیں کہا تھا نا ذوالقرنین! یہ جو کھلاڑی اور آرٹسٹ ہوتے ہیں نا، یہ دھن کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی بھی نہیں کی جا سکتی۔''

خدیجہ نے بھائی سے یہ بات چھپائی کہ نور اس سے بڑی سرد مہری سے ملی ہے۔

اگلے روز ذوالقرنین عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف خدیجہ کی ایک دوست تبسم تھی۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

''ذوالقرنین بھائی! خدیجہ زخمی ہو گئی ہے۔ شیخ زید اسپتال میں ہے۔ آپ جلدی آئیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' ذوالقرنین چلا کر بولا۔

''فیڈریشن کے آفس میں لڑائی ہوئی ہے۔ نشو اور اس کی دوستوں نے خدیجہ کو بری طرح مارا ہے۔ اس کی...... کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور بھی کئی زخم ہیں۔''

ذوالقرنین اپنی ایف ایکس پر آندھی کی رفتار سے شیخ زید اسپتال پہنچا۔ خدیجہ ابھی ایمرجنسی میں ہی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی پر عارضی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کے سر، کندھے اور پاؤں کی انگلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تنظیم کی کئی ممبران بھی وہاں موجود تھیں۔ زخمی ہونے کے باوجود خدیجہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ ذوالقرنین نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔ پھر تبسم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ فیڈریشن کے آفس میں نشو کے اعزاز میں ایک فنکشن تھا۔ خدیجہ اکیلی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اسٹیج پر آ کر اور ڈائس کے سامنے نشو کے خوب لتے لیے۔ اسی پر لڑائی ہو گئی۔

ایک دوسری لڑکی بولی۔ ''خدیجہ باجی نے غلطی کی، اگر ایسا کچھ کرنا تھا تو کم از کم ہم میں سے دو چار کو انفارم کر دیتیں۔''

واقعے کی جو تفصیل معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ خدیجہ کے اندر نشو کے لیے مسلسل غصہ پل رہا تھا۔ آج اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ فیڈریشن کے آفس پہنچ گئی۔ وہاں نشو اور ایچی سن کالج کی ارم کو نقد انعامات دیے جانے والے تھے۔ جب نشو ڈائس پر آئی تو خدیجہ نے وہاں پہنچ کر مائیک کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ نشو کی چیمپئن شپ کو فراڈ قرار دیا...... اور بتایا کہ اس نے کس طرح ''پری پلاننگ'' اصل حق دار نور کو ایونٹ سے باہر کیا ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ ہٹی کٹی لڑکی بھی موجود تھی جس نے نور کی ٹانگ پر کرسی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگائی تھیں۔ وہ حاضرین میں سے نکل کر خدیجہ پر جھپٹ پڑی۔ خدیجہ نے اس کی بھی ٹھکائی کر دی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ نشو بھی پہلے تو سکتہ زدہ کھڑی رہی مگر پھر خدیجہ پر جھپٹی۔ خدیجہ نے اسے ایک یادگار طمانچہ رسید کیا۔ بعد میں تقریباً اسے بھی طمانچے پڑے اور وہ زدوکوب بھی ہوئی مگر وہ پہلا طمانچہ درجنوں کیمروں میں ریکارڈ ہو گیا۔

☆☆☆

مہرین نے نور کو زبردستی بیڈ پر نیم دراز کر رکھا تھا اور اس کو گھٹنے کی مختلف ورزشیں کرا رہی تھی۔ اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجی۔ مہرین نے کال ریسیو کی اور اس کے تاثرات میں ہلچل مچ گئی۔ دوسری طرف سے کسی جھگڑے کی بات ہو رہی تھی۔ فون سننے کے بعد مہرین نے نور سے کہا۔

''اچھی خبر نہیں، خدیجہ اور نشو کی لڑائی ہوئی ہے۔ خدیجہ کا بازو فریکچر ہو گیا ہے، اسپتال میں اس کا آپریشن ہو گا۔''

''اوہ گاڈ۔'' نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کس نے بتایا ہے؟''

''میری کولیگ ہے...... وہ بھی شیخ زید کے فزیوتھراپی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔''

''لیکن معاملہ کیا تھا...... کوئی اپنی بھی دشمنی ہے ان کی؟''

''نہیں بھئی۔ تمہاری والی دشمنی ہی ہے۔ ایک فنکشن میں خدیجہ ڈائس پر پہنچ گئیں اور خطاب فرماتی ہوئی نشو کا اچھا خاصا ریمانڈ لیا۔ کافی ہنگامہ ہوا ہے۔''

آدھ پون گھنٹے میں نور اور مہرین کو اس واقعے کی ساری تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ چند دن پہلے نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی سلطانہ اس لڑائی میں اسٹیج سے گر کر تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ نشو کے ورثاء پرچہ وغیرہ بھی درج کرا دیتے مگر چونکہ خدیجہ کو بھی سخت چوٹ لگی تھی اس لیے ابھی تک پولیس کو انفارم نہیں کیا گیا تھا اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

''خدیجہ اچھی بھلی سمجھدار ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں میرے لیے لڑائی مول لے رہی ہیں۔''

''کبھی کبھی اس طرح کی بات اپنے بس میں نہیں رہتی نور! صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو پھر زیادہ ہی چھلک جاتا ہے۔ میں نے اس دن نوٹ کر لیا تھا کہ تمہیں دیکھ کر خدیجہ بہت پریشان ہو گئی ہیں......''

تین دن بعد کی بات ہے، نور اور مہرین نے خدیجہ کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ کا آپریشن کامیابی سے ہو چکا تھا۔ نور چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اسپتال پہنچیں جب خدیجہ کا بھائی ذوالقرنین آس پاس موجود نہ ہو۔

خدیجہ پرائیویٹ روم میں تھی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہ روم میں اکیلی ہی تھی۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں، ایک خوبصورت ''گلدستہ'' اس کے سرہانے رکھ دیا۔ رسمی کلمات کے بعد نور نے کہا۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا خدیجہ...... خوامخواہ لڑائی مول لی۔ آپ تو مجھے سمجھاتی تھیں کہ ان باتوں میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

''پتا نہیں نور کہ کیسے ہو گیا۔ جب میں تم سے مل کر آئی تو میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں وہاں پہنچ گئی۔ آئی ایم سوری لیکن ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔''

''آپ جانتی ہیں خدیجہ! یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔''

''نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہو گی انشاء اللہ! انہیں پتا تھا کہ اگر وہ پولیس تک گئے تو پھر بات آگے تک جائے گی۔ کل صلح صفائی کی بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صاف بتایا ہے کہ وہاں فیڈریشن کے دفتر میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔''

''مگر اس سے فائدہ کیا ہوا خدیجہ؟'' نور نے جز بز ہو کر کہا۔

''بہت فائدہ ہوا ہے نور! کم از کم ان لوگوں کو ایک جواب تو ملا ہے۔ اب آئندہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچیں گے۔ تمہیں پتا چلا ہی ہو گا، وہ ماڈرن غنڈی تو اسٹیج سے گر کر کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی......''

مہرین بولی۔ ''مگر آپ کو بھی تو قیمت چکانا پڑی خدیجہ آپی! آپ اسپتال میں پڑی ہیں۔''

''کوئی قیمت نہیں۔'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

بھلی چنگی ہوگئی ہوں، کل تک شاید چھٹی بھی مل جائے۔"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور ذوالقرنین تولیے سے بازو صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ذوالقرنین کو دیکھ کر نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا ٹھٹکا پھر اس نے شائستگی سے "السلام علیکم" کہا۔ نگاہیں حسب معمول جھکی ہوئی تھیں۔ نور اور مہرین نے جواب دیا۔ وہ شاید وضو کر کے نکلا تھا۔ بولا۔ "خدیجہ! نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ مہرین نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون تھے خدیجہ آپی؟"

"میرا بھائی ذوالقرنین۔"

"اچھا، آپ انہی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں؟"

خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بہت زیادہ خیال رکھتا ہے میرا۔ چار دن سے مسلسل یہاں میرے پاس ہے۔"

اسی دوران میں مہرین کی وہ دوست آ گئی جو اسی اسپتال میں فزیوتھراپسٹ تھی۔ مہرین اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں ایک بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ نور کے علاوہ جیسے خدیجہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ آخر نور نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ پہلے سے جانتی ہیں؟"

"کیا؟" خدیجہ نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "یہی کہ میں وہی ہوں جس کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے آپ کے بھائی کے رشتے کی بات چلی تھی؟"

خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہاں نور...... میں جانتی تھی...... مگر میں نے تمہیں بتایا نہیں...... مجھے ڈر تھا کہ تمہیں پتا چل گیا تو ہماری دوستی شروع میں ہی ختم ہو جائے گی لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میرے اور تمہارے ملنے میں کوئی پلاننگ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک ہی کالج میں تھیں، جو کچھ ہوتا رہا خود بخود ہوتا رہا۔"

"...... آپ میرے لیے صرف خدیجہ ہی رہتیں تو بہت اچھا ہوتا۔" نور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہمارے درمیان اور کوئی تعلق بھی نہیں آئے گا۔"

اس سے پہلے کہ خدیجہ مزید کچھ کہتی، مہرین اور اس کی دوست واپس آ گئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نور اب جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے رخصت ہو کر وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں تو ان کی ملاقات پھر ذوالقرنین سے ہوگئی۔ وہ کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس وغیرہ لے کر اوپر آ رہا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"جی ہاں۔ گھر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔" مہرین نے جواب دیا۔

"آپ پانی تو پی لیتیں۔"

"شکریہ۔ دیر ہو رہی ہے۔" مہرین نے کہا۔

وہ دونوں سلام لیتے ہوئے نیچے اتر آئیں۔

راستے میں مہرین نے گہری نظروں سے نور کو دیکھا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ویسے نور! بندہ اتنا برا بھی نہیں لگتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"سیانے کہتے ہیں نا کہ شکلوں پر نہیں جانا چاہیے۔ شکل صورت سے یہ ذرا سخت مزاج اور گم صم سا ہے مگر جب بات کرتا ہے تو اور طرح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔"

"اچھا، تم زیادہ مردم شناس نہ بنو۔" نور نے چڑ کر کہا۔

"یار! میں تو ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔"

"لیکن میرے لیے یہ عام نہیں ہے مہرین! میں اس طرح کے کسی بندے کو اپنی زندگی میں لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کوئی آئیڈیل؟" مہرین دبی دبی شوخی سے بولی۔

"نہیں۔ کوئی آئیڈیل نہیں مگر یہ قاری ذوالقرنین بھی نہیں۔"

نور کا موڈ دیکھتے ہوئے مہرین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

...... پندرہ بیس روز گزر گئے۔ انہوں نے دوبارہ خدیجہ کی خیر خیریت دریافت نہیں کی حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ کم از کم ایک بار تو اسے فون کر لیتیں۔ (نور نے مہرین کو بتا دیا تھا کہ خدیجہ اور اس کے درمیان ذوالقرنین والی بات کھل چکی ہے) آخر ایک روز مہرین نے خدیجہ کو فون کر ہی دیا۔ حال احوال پوچھا۔ نور نے بھی تھوڑی سی بات کی۔ گفتگو کے آخر میں خدیجہ نے نور سے کہا۔ "نور! تمہارے پاس اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ مہرین تھی، باہر چلی گئی ہے۔"

خدیجہ بولی۔ "تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نور؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے بھی خفا

نہیں ہوسکتی۔ میرے دل میں آپ کا ایک مقام بن چکا ہے۔بس تھوڑا سا افسوس ضرور ہے۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ ماضی کی ایک بات ہمارے درمیان آ گئی ہے۔ہم پہلے کی طرح آزادانہ نہیں مل سکتیں لیکن کچھ بھی ہے خدیجہ! آپ دور رہ کر بھی میرے قریب ہی رہیں گی۔''

دوسری طرف کچھ دیر بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''نور! اس دن اسپتال میں، میں نے تم سے ایک فقرہ کہا تھا، اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں...... تمہیں یاد ہے؟''

نور نے کہا۔''ہاں، آپ نے کہا تھا، میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔''

''میں اپنی اس بات پر قائم ہوں نور۔بس تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔یہ پہلی اور آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔اس موضوع کا صفحہ ہماری گفتگو کے باب میں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو جائے گا۔''

''آپ...... کیا...... کہنا چاہتی ہیں؟''

''نور! ہر بہن کو اپنا بھائی پیارا ہی ہوتا ہے لیکن میں جو بات کہنے جا رہی ہوں، یہ بالکل بے لاگ ہے...... وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے نور! اس کی محبت میں اتنی گہرائی ہے کہ کبھی کبھی میں ڈر جاتی ہوں۔شاید تمہیں معلوم نہ ہو جب تم دونوں کے رشتے کی بات ختم ہوئی تو وہ کئی دن اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔اب کافی عرصہ گزر چکا ہے، وہ گھر والوں پر ظاہر تو کچھ نہیں کرتا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے۔پچھلے چند مہینوں میں کئی موقعے ایسے آئے جب اچھی جگہ اس کا رشتہ ہو سکتا تھا مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں نور......''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔شاید خدیجہ منتظر تھی کہ نور ہنکارا بھرے گی مگر وہ چپ رہی۔خدیجہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''نور! ہم بچپن سے ایک دوسرے کے رازداں تھے۔چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔مار بھی اکٹھے کھاتے اور ہمیں پیار بھی اکٹھا ہی ملتا تھا۔میں اسے مذاق میں اخروٹ کہا کرتی تھی۔جب وہ غصہ کرتا تو میں کہتی، ذوالقرنین! میں تمہاری تعریف کر رہی ہوں۔اخروٹ اوپر سے سخت لیکن اندر سے کتنا نرم ہوتا ہے۔وہ کہتا کہ پھر تم خرمانی ہو، اوپر سے نرم لیکن اندر سے سخت۔ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں نور۔وہ جتنا سنجیدہ اور کم گو ہے، اندر سے اتنا ہی خوش مزاج ہے۔وہ تمہیں بہت پیار دے سکتا ہے نور...... تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ وقتی جذبہ نہیں ہوگا۔اس میں اتنی پائیداری ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔تم میری بات سن رہی ہو نا؟''

نور ذرا توقف سے بولی۔''میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتی...... صرف یہی گزارش ہے کہ...... آپ...... اپنے وعدے پر قائم رہیے گا...... میرا مطلب ہے...... آپ جو کہنا چاہتی تھیں آپ نے کہہ دیا...... اور میں نے سن لیا۔اب اگر ہم...... کبھی کوئی بات چیت کریں گے تو اس میں یہ موضوع نہیں آئے گا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ سناٹا سا رہا پھر خدیجہ کی بوجھل آواز ابھری۔''ٹھیک ہے نور! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لیکن تم اس بارے میں ایک بار سوچنا ضرور۔''

رسمی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ابھی وہ ریسیور رکھ ہی رہی تھی کہ تائی جان آ گئیں۔آج کل ان کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔اب بھی ان کی پیشانی پر ہلکا سا بل موجود تھا۔بولیں۔''کس سے بات کر رہی تھیں؟''

''خدیجہ تھیں۔ان کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔''

تائی بولیں۔''دیکھو اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ خدیجہ، اسی ذوالقرنین کی بہن ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔''

''آپ اس بارے میں بے فکر رہیں تائی امی۔اب بھی میں نے فون نہیں کیا تھا۔مہرین نے حال چال پوچھنے کے لیے کال ملائی تھی۔''

تائی جان نے نور کی جانب پُرسوچ انداز میں دیکھا پھر اس کے قریب ہو گئیں۔نرم لہجے میں بولیں۔''دوپہر کو جب تم سو رہی تھیں تو تمہاری کوچ میڈم فرحانہ کا فون بھی آیا تھا۔تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔میں نے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

نور خاموش بیٹھی رہی۔

تائی راحت نے دلار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔''نور! کئی کاموں میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ہم کتنی بھی کوشش کر لیں وہ کام ہو نہیں پاتے۔تم نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے کھیل کے میدان میں۔کوئی کسر اٹھا نہیں

رکھی۔ تمہارے تایا ابا نے بھی اپنی حیثیت اور ہمت سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ذرا دوسرے انداز میں سوچنا چاہیے۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تین چار سال کا ایک دور ہوتا ہے جس میں ان کا گھر بس جانا چاہیے، ورنہ مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔"

"آپ...... کیا کہنا چاہتی ہیں تائی امی؟" نور ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"تم ہمیں بہت پیاری ہو نور...... جس طرح یہ مہرین کا گھر ہے اسی طرح تمہارا بھی ہے لیکن ایک دن تو مہرین کو بھی جانا ہی ہے نا۔ میرا مشورہ ہے نور کہ اب تم گھر گرہستی کے بارے میں سوچو، ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہے تم میں۔ اچھے سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔"

نور نے تائی کی طرف دیکھا اور بولی۔" کیا تایا ابا نے یہ کہا ہے؟"

"انہوں نے کہا تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ رات دن تمہاری بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہارے ابا جی کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ تمہارے کاموں میں تمہارے والد کی مرضی شامل ہو۔ اسی میں خیر ہے اور اسی میں دین دنیا کی بھلائی بھی ہے۔"

"میں نے تو ہر طرح کوشش کر کے دیکھی ہے تائی امی۔ ان کی ناراضگی وقتی طور پر کچھ کم تو ہو جاتی ہے مگر دور نہیں ہوتی۔"

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولیں۔" اور اس کی وجہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہو جب تک تم یہ بھاگ دوڑ والا کام چھوڑو گی نہیں، ان کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوگا۔ میرا تو مشورہ یہی ہے نور! اب تم میڈم فرحانہ سے صاف صاف بات کر لو۔ انہیں بتا دو کہ تم کلب میں نہیں آؤ گی۔ سیانے کہتے ہیں کہ باپ کی بددعا نہیں لینی چاہیے۔ وہ بڑی سخت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کسی ایسی ہی سختی کی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔ پلیز نور...... پلیز۔" انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا اور ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے دیوار کو گھورتی رہی۔ تائی راحت کچھ دیر انتظار کرتی رہیں پھر جز بز سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

نور نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر ڈھے سی گئی...... "میں کیا کروں میرے خدا ...... کس طرف جاؤں؟" وہ دل ہی دل میں پکاری۔

پتا نہیں کیوں جب وہ رننگ سے پیچھے ہٹنے کا سوچتی تھی اور ابا جان کی نصیحتوں کے سامنے سر جھکانے کا سوچتی تھی تو اس کے سامنے ایک دیوار سی کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ کیسی دیوار تھی؟ کیا یہ انا کی دیوار تھی؟ کیا یہ اس عزم کی دیوار تھی کہ اس نے کچھ بن کر دکھانا ہے اور تایا ابا کا سر لوگوں کے سامنے جھکنے نہیں دینا؟ کیا اس دیوار کی تعمیر اس کے اندر کے جنون سے ہوئی تھی، وہ جنون جو سو میٹر کے ٹریک سے وابستہ تھا؟

اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ابا جان اپنے نظریات پر بالکل درست ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی ناراضگی بھی بجا ہے اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ ابا جان اس سے راضی ہو جائیں۔ اس کا مقصد ہرگز بھی ان کے نظریات و خیالات سے ٹکرانا نہیں تھا مگر وہ اپنے اندازِ زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ بہت دیر سوچتی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدلنے لگے، ذہن تھک سا گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سوتے جاگتے کی درمیانی کیفیت میں تھی۔ اس نے تصور میں دیکھا۔ اسے دلہن بنایا گیا ہے۔ بھاری بھرکم چمکیلے کپڑے، زیورات، چوڑیاں، نیکلس، ناک میں نتھلی، چہرے پر میک اپ کی تہ۔ وہ سکڑی سمٹی بیٹھی ہے...... جس طرح اس کے گاؤں موراں والی کی لڑکیاں دلہن بن کر بیٹھتی تھیں۔ ایک ہیولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کا دلہا ہے، شاید ذوالقرنین ہے۔ ہاں ذوالقرنین ہی ہے۔ وہ اسے دبوچتا ہے، مسہری پر گراتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چاپڑ (برچھا) ہے۔ وہ کہتا ہے...... چلو ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم اس جھگڑے کو ختم کرتے ہیں جو ہماری ازدواجی زندگی میں زہر گھول سکتا ہے۔ وہ بے دردی سے چاپڑ چلاتا ہے اور نور کے دونوں پاؤں ٹخنوں کے پاس سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ لرزتے ہوئے سفید پاؤں کمرے کے گلابی قالین پر پڑے ہیں۔

نور جیسے تڑپ کر اپنے تصور سے باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، اپنی گردن کو جھٹکو یا اور باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک دیوار پر فلورنس کی تصویر آویزاں تھی۔ امریکا کی وہی فلورنس جس نے 10.49 سیکنڈ کا عالمی ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اس تصویر میں وہ برق کی رفتار سے فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہزاروں نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی، پھر ایک گہری لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر پھر تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ دور کہیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر کسی گیت کے

بول گونج رہے تھے۔ گر گر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے...... جل جائیں مگر آگ پہ چلتے ہی رہیں گے۔

وہ ذرا جھک گئی اور اپنے گھٹنے کا جائزہ لینے کے لیے آہستہ آہستہ ٹانگ کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ دن کا اجالا اور رات کا اندھیرا ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے...... گھڑی کی سوئیاں متحرک رہیں...... اسی طرح چار ماہ گزر گئے۔ نور ابھی تک تایا ابا کے گھر میں تھی۔ تائی راحت کے رویے میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر تایا ابا بدستور اس کے ساتھ جم کر کھڑے تھے۔ وہ ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے۔ انہوں نے کبھی اسے رننگ سے دور جانے کا مشورہ نہیں دیا...... ہاں کسی وقت اتنا ضرور کہتے کہ وہ دیگر معاملات پر بھی توجہ دے اور اپنے والد سے اپنا فاصلہ گھٹانے کی کوشش کرے۔ وہ جیسے، نور سے خفا ہونا یا اس کی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔

دو ڈھائی ماہ کے مکمل آرام کے بعد نور ایک بار پھر رننگ میں حصہ لینا شروع کر چکی تھی۔ اب گھٹنا اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ وہ اپنی پہلی فارم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پہلے والی فارم حاصل ہو تو جائے گی مگر آسانی سے نہیں۔ وہ اب گاہے بگاہے ٹریننگ سینٹر (ایف اے ایس) بھی جاتی تھی۔ تایا ابا اسے چھوڑ کر آتے تھے اور واپس بھی لاتے تھے۔ وہ کسی عذر کو اس معمول کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے......

بسمہ کو تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ کئی جگہ جیت بھی چکی تھی۔ ابا جان کی غیر موجودگی میں دونوں بہنیں آپس میں مل بھی لیتی تھیں...... اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتی تھیں۔

خدیجہ یا اس کے بھائی ذوالقرنین کے ساتھ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ایک بار نور کا دل چاہا کہ وہ کم از کم فون کر لے اور خدیجہ کی خیریت دریافت کرے مگر پھر وہ فون کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ ایسے موقعوں پر عجیب سی کشمکش اس کے اندر نمودار ہو جاتی تھی۔

اور پھر ایک دن نور کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس واقعے نے اسے اپنے والد سے کچھ اور دور کر دیا ہے۔ نور چھت پر بیٹھی پیپرز کی تیاری کر رہی تھی کہ تائی راحت اس کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کا انداز دیکھ کر ہی نور کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''نور! تمہیں کچھ پتا چلا ہے اشفاق کے بارے میں؟''

''کیوں، کیا ہوا ہے ابا جان کو؟'' وہ چونک گئی۔

''وہ شادی کر رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، نکاح کر رہے ہیں۔''

وہ کتنی دیر سناٹے میں رہی...... پھر بہ مشکل بولی۔

''آپ سے کس نے کہا ہے؟''

''کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ایک دو روز میں ہونے والا ہے۔ کوئی بیوہ عورت ہے۔ بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ امام مسجد صاحب کی کوئی عزیزہ ہے۔ انہوں نے ہی بات طے کرائی ہے۔''

''مگر...... وہ......'' نور کچھ بول نہ سکی۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تائی راحت نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا عجیب تو لگتا ہے مگر شرعی طور پر اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ تمہاری امی کے انتقال کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ڈھائی تین سال بیماری کے بھی کاٹے۔ شاید اشفاق کو دکھ سکھ کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ تم بہنوں نے تو بیاہ کرا کے اپنے گھروں کو چلے جانا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ توقف سے بولی۔

''شاید اسی لیے ابا جان کو ہمیں بیاہ دینے کی جلدی تھی۔''

''نہیں نور! ہر بات کو منفی انداز میں نہیں لیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے تمہارے رشتے کی بات چلانے میں بہت جلدی کی...... اور شاید وہ لڑکا تمہارے جوڑ کا بھی نہیں تھا مگر نیت تو ان کی ٹھیک ہی رہی ہو گی۔ وہ دراصل تمہاری مصروفیات سے بھی ڈرے ہوئے تھے اور...... دیکھا جائے تو ان مصروفیات نے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں دیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر......'' پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ غالباً انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس موقعے پر یہ نیا موضوع چھیڑنا مناسب نہیں۔

انہوں نے نور کو بتایا کہ وہ خود بھی اس خاتون سے ملی ہیں۔ ملنسار اور اچھے مزاج کی لگتی ہیں۔ تم تینوں بہنوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ تمہارے بارے میں تو پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتی ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ کسی اخبار میں تمہاری تصویر بھی دیکھی تھی۔

تائی راحت باتیں کر رہی تھیں اور نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے عجیب سی شرمساری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے والد دوسری شادی کر رہے تھے۔

یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ آیا اور گزر گیا۔ ابا جان چند فراد کے ساتھ گئے اور زلفت نامی اس خاتون کے ساتھ نکاح کر کے اسے گھر لے آئے۔ پھوپھا جرہ کے علاوہ تایا ابا بھی بوجھل دل کے ساتھ اس مختصر تقریب میں شریک ہوئے۔ ماموؤں نے شرکت نہیں کی۔ نور بھی اس وقت شریک ہوئی جب اس کی نئی امی گھر آ چکی تھیں۔ چھریرے جسم کی دراز قد کشمیری خاتون تھیں۔ عمر 35 اور 40 کے درمیان رہی ہوگی۔ اپنی اس ''نئی والدہ'' سے مل کر نور کو اتنا برا نہیں لگا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بیگم زلفت نے اسے پیار کیا، اپنے پاس بٹھایا اور محبت آمیز باتیں کرتی رہیں۔ پھر بھی کوشش کے باوجود نور زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مرحومہ والدہ جنہوں نے ساری عمر ابا جان کی جھڑکیاں سہی ہیں، کہیں آس پاس ہی موجود ہیں اور نم آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

دو ڈھائی سال بعد یہ پہلا موقع تھا جب ابا جان نے اس کے سر پر پیار دیا اور نارمل انداز میں چند باتیں بھی کیں مگر نور جانتی تھی کہ یہ عارضی تبدیلی ہے۔ ابا جان کے اندر جو ناراضی جڑ پکڑ چکی ہے وہ اپنی جگہ قائم ہے۔ ایک عجیب سی دیوار حائل تھی باپ اور بیٹی کے درمیان۔

''میں مانتی ہوں ابا جان آپ اپنی جگہ بالکل درست ہیں...... شاید میں ہی غلط ہوں...... مگر...... مگر یہ کیسی جنگ میرے اندر ہوتی رہتی ہے۔ مجھے جو بھی صلاحیتیں ملی ہیں وہ بھی تو اللہ کی طرف سے تحفہ ہے میرے لیے۔ میں نے تو کبھی کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہا۔ ہمیشہ اللہ کی نیک بندی اور آپ کی فرماں بردار بیٹی بن کر رہنا چاہا...... معلوم نہیں قدرت کو مجھ سے کیا کام لینا ہے...... میرے پیارے ابا جان...... بس مجھے زندگی میں اس ایک لمحے کا انتظار ہے۔ جب میں آپ کے سامنے سرخ رو ہو جاؤں گی۔''

اس دن گھر آ کر نور دیر تک روئی۔ اس کا رونا آنسوؤں کی صورت میں نہیں ہوتا تھا، بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہتے تھے۔ دل میں ایک دھواں سا بھر جاتا تھا اور یہ دھواں آنکھوں تک آ کر شدید جلن میں بدل تا رہتا تھا۔

وہ تکیے میں چہرہ گھسا کر جیسے خیالوں ہی خیالوں میں بہ زبانِ خاموشی اپنے ابا جان سے مخاطب ہوتی...... ابو! میں تیسری تھی نا۔ اُن چاہی تھی نا...... آپ نے ہمیشہ مجھے خود سے کچھ فاصلے پر رکھا لیکن میں تو آپ کے بہت قریب تھی۔ ہر وقت آپ کی بانہوں میں سمائے رہنا چاہتی تھی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنا چاہی۔ بچپن سے ہی اس کھوج میں رہتی تھی کہ میری کوئی بات آپ کو بھا جائے، آپ آپی بتول اور بسمہ سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھیں۔ جب آپ نہیں دیکھتے تھے تو میں اور سہارے ڈھونڈتی تھی، شاید تایا جان کی مہربان آغوش میں بھی آپ کی محبت ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ میری یہ حسرت میرے ساتھ ہی جوان ہوتی رہی ہے ابو! آپ کو کیا پتا میں نے آپ کی توجہ پانے کے لیے کیا کیا جتن کیے لیکن میرا ہر جتن مجھے آپ سے دور ہی لے گیا۔ میں چاہت کی نگاہ کو ترستی تھی لیکن آپ نے تو کبھی مجھ پر رحم کی نگاہ بھی نہ ڈالی۔

وہ دیر تک اسی انداز میں سسکتی رہی پھر سو گئی۔

اس کی نئی امی زلفت نے دو تین ہفتے میں ہی گھر میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ نور اور بتول سمیت ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ نور کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کے اور ابا جان کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک روز وہ نور کو زبردستی گھر لے گئیں۔ وہ شام تک وہاں رہی پھر ایک دن جب تایا ابا کی طبیعت کچھ ناساز تھی، وہ ان کی عیادت کے لیے آ گئیں۔ ابا جان بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ کوشش کرتی رہیں کہ نور کے ابا جان، نور سے بھی بات کریں اور ان دونوں کے درمیان جو ایک دیوار سی کھڑی ہو چکی ہے، وہ مسمار ہو۔ اس دن پہلی بار نور نے خود پر جبر کر کے ان کو ''چھوٹی امی'' بھی کہا۔

ایک روز جب تایا جان اپنے کام کے سلسلے میں گجرات گئے ہوئے تھے اور مہرین کالج میں تھی، چھوٹی امی ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اکیلے میں نور کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''نور! اس بات میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس تمہاری طرف سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے اور یہ انہیں ہر وقت دکھی رکھتی ہے۔''

''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ٹھیس پہنچنے میں میرا قصور ہے؟ کیا آپ جانتی ہیں کہ جس وقت میرے رشتے کی بات چلائی گئی اس وقت میری عمر کیا تھی؟''

''مجھے سب پتا ہے بٹیا جی! اور میں مانتی ہوں کہ اس معاملے میں ان سے ذرا جلدی ہوئی ہے مگر اب تو ان باتوں کو لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔''

''لمبا عرصہ گزر چکا ہے پر مجھے معلوم ہے کہ ابا جان کے دل سے نکلا کچھ نہیں۔ وہ آج بھی یہی کہیں گے کہ میں موٹی سی چادر اوڑھ کر اور گھونگٹ نکال کر گھر میں بیٹھ جاؤں اور چپ چاپ اسی جگہ شادی کر لوں جہاں وہ کہتے تھے۔''

''اس جگہ شادی والی بات تو میں بھی نہیں مانتی......

لیکن نورا! جہاں تک کھیل والی بات ہے..... شاید اب تم بھی محسوس کرتی ہوگی کہ..... یہ سفر اب کافی لمبا ہو گیا ہے۔ تم نے ماشاء اللہ کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس معاملے پر پھر غور کرو۔"

نور نے ذرا بے رخی سے کہا۔ "چھوٹی امی! اگر آپ مجھے یہی سب کچھ سمجھانے آئی ہیں تو پلیز..... نہ سمجھائیں۔ آخر ایک دن تو مجھے کھیل چھوڑنا ہی ہے لیکن کب چھوڑوں گی، اس کا فیصلہ میں نے خود کرنا ہے۔"

"اچھا..... تم اپنے اندازے کے مطابق کوئی ٹائم بتا دو کہ کب تک یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا؟ میں تمہارے ابو کو مطمئن کر لوں گی۔"

"اگر انہوں نے اس شرط پر مطمئن ہونا ہے تو بے شک نہ ہوں۔" وہ جھلا کر بولی۔ شاید اٹھ ہی کھڑی ہوتی مگر چھوٹی امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پچکارنے لگیں پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور سر چوما، بولیں۔

"میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ تمہیں بھی اسی طرح تمہارے ابا جان سے باتیں کرتے دیکھوں جس طرح بتول اور بسمہ کرتی ہیں۔ اللہ وہ دن جلدی لائے۔"

وہ اس سے بڑی بہن بتول اور اس کے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور بتانے لگیں کہ کس طرح وہ بتول کے شوہر غیاث کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے نور کی دادی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ ذرا سخت مزاج تو ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی نور کو پھر سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نور اور مہرین بازار گئیں۔ کچھ شاپنگ کرنا تھی، سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ شاہراہ قائداعظم کے ایک ریستوران میں جا کر سوپ پینے لگیں۔ دو نو عمر لڑکیوں نے نور کو پہچان لیا اور اس سے ایتھلیٹکس کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران میں نور کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ پر جوش افراد کی ایک ریلی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور کتبے لہرا رہے تھے۔ نور دیکھ کر چونکی، ریلی میں سب سے آگے ذوالقرنین نظر آ رہا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی ڈھول میں اٹی ہوئی تھی اور بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

وہ بلند بھاری آواز میں پکارا۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟"

نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ غالباً اسی تنظیم اصلاح معاشرے کی ریلی تھی۔ کتبے اور بینرز کچھ اس قسم کے تھے..... فحاشی و عریانی نامنظور۔ امریکیوں، یہودیوں کے ایجنڈے نہیں چلیں گے۔

تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ریلی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی اور اس کے عقب میں رینگتی ہوئی ٹریفک دکھائی دینے لگی۔ مہرین نے کہا۔ "بھئی! یہ تو وہی ہے خدیجہ کا بھائی..... اس وقت تو پورا پورا لیڈر لگ رہا تھا۔"

"چلو پورا پورا لیڈر ہو یا آدھا آدھا، ہمیں کیا۔" وہ سوپ کا چمچ لیتے ہوئے بولی۔

"ہمیں ہے نا بھئی۔ ریلی تو گزر گئی مگر ٹریفک پھنس گئی۔ ابھی ہم نکلیں گے تو کچھ نہ کچھ بھگتنا پڑے گا۔"

"بھگت لیں گے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر چند لمحے توقف کر کے کہا۔ "خدیجہ سے تو بات نہیں ہوئی دوبارہ؟"

"تم نے ہی روک دیا تھا، میرا تو دل چاہ رہا تھا۔"

"دراصل دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ ایک عجیب سی انسیت محسوس ہوتی ہے ان سے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ گلاب کے ساتھ کانٹا بھی ہو تو گلاب کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"لیکن کانٹا بھی تو گلاب کا بھائی ہی ہے نا۔ ویسے ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا کانٹا بھی نہ ہو۔ جب تک بندے کو پرکھا نہ جائے اس کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھو نا..... وہ جو اسپورٹس صحافی فرہاد تھا شکل سے کیسا لگتا تھا، مگر نکلا کیا؟"

اس موضوع نے نور کو بدمزہ کر دیا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

مہرین بولی۔ "لگتا ہے کہ فرہاد کے ذکر نے تمہارا منہ کڑوا کر دیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز منگواتے ہیں۔" اس نے ویٹر کو بلایا۔

نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ٹریفک رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ جن دو کم سن لڑکیوں نے نور سے آٹوگراف لیے تھے، وہ دور ایک کرسی پر بیٹھی اشتیاق سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے بڑی اہم تھی۔ شاید ایک اسٹار کی حیثیت رکھتی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹار کن کالے بادلوں کی زد میں ہے۔ پتا نہیں کیوں اب کبھی کبھی مایوسی بھی اس پر طاری ہونے لگتی تھی۔ محنت اور مسلسل محنت مگر وہ صلہ کہیں نہیں تھا جس کی وہ آرزو مند تھی۔ پھر تایا ابا کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ نور کی ایک ہار کے موقع پر انہوں نے کہا تھا..... خدا کے گھر میں دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں۔

اس شام جب وہ بازار سے گھر پہنچیں تو ٹی وی آن تھا۔ ان دنوں پی ٹی وی کے علاوہ بس دو چار چینلز ہی اور ہوتے تھے جن میں سی این این اور این ٹی ایم وغیرہ کے

علاوہ ایک اسپورٹ چینل بھی تھا۔ وہاں ایک نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا...... ''مسٹر فرہاد کا تعلق اسپورٹس نیوز کے شعبے سے ہے۔ وہ ایک بڑے میگزین کے اسپورٹس انچارج ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی ایک ویڈیو کلپ چلایا گیا جس میں ایک اسٹریچر کو تیزی سے کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل کیا جا رہا تھا۔ نیم بے ہوش فرہاد صاف پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے سر، دونوں بازوؤں اور ایک پاؤں پر پٹیاں تھیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''میاں بیوی کے درمیان خلع کے کیس کی خبر دو دن پہلے آئی تھی۔ ایتھلیٹ شاہینہ کے والد کی طرف سے فرہاد پر کیس کیے جانے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن آج جو واقعہ ہوا وہ زیادہ غیر متوقع ہے۔ شاہینہ کے بھائیوں کی طرف سے فرہاد کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ گاڑی پر سوار جیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی روک کر اسے اور اس کے وکیل دوست کو باہر گھسیٹا گیا اور فرہاد کو سڑک پر لٹا کر بے دریغ مارا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے ہیں۔ اس سے گاڑی بھی چھین لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہنڈا گاڑی بھی اسے سسرال کی طرف سے ہی ملی ہوئی تھی اور بیوی کے نام رجسٹرڈ تھی۔''

نور اور مہرین حیرت میں گم یہ سب کچھ سنتی رہیں۔ آج ہی ان کی گفتگو میں فرہاد کا ذکر آیا تھا اور آج ہی یہ خبر سننے میں آ گئی تھی۔ رات تک اس بارے میں مزید تفصیل کا پتا بھی مختلف ذریعوں سے چلا۔ معلوم ہوا کہ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی شاہینہ اور فرہاد میں اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ فرہاد کی نگاہ سراسر شاہینہ کے والد کے روپے پیسے پر تھی۔ اس کے علاوہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار کی تنبیہہ اور وارننگ کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بالآخر نتیجہ خلع کے مطالبے، دیگر کیسز اور فرہاد کی شدید درگت کی صورت میں نکلا۔

کمرے میں بند نور دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے کافی عرصے بعد بالآخر اس کے نہایت شدید اور توہین آمیز دکھ کا مداوا ہو گیا ہے۔ فرہاد نے جس طرح اسے اپنے کھیل کا حصہ بنایا اور مطلب نکلنے کے بعد منہ پھیرا، وہ سب نور کے لیے ایک کربناک تجربہ تھا اور یہی کربناکی تھی جس نے اسے اپنے کیریئر کے نہایت اہم دور میں ایک حوصلہ شکن شکست سے دوچار کیا تھا۔

ایک بار پھر تایا ابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے...... اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ہاں یہاں بھی شاید دیر تو ہوئی تھی مگر مکافات کا قانون حرکت میں آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہو کر تکیے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگی...... کیا اس کی مسلسل محنت، جانفشانی اور غیر مشروط کمٹ منٹ کے حوالے سے بھی کوئی قانون قدرت حرکت میں آئے گا؟ اسے اور اس کے تایا ابا کو کوئی صلہ ملے گا؟

اگلے روز تایا ابا سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے کہیں اخبار میں یہ خبر دیکھی تھی۔ بولے۔ ''نور! تمہیں پتا چلا ہے اس فرہاد کے بارے میں؟''

نور نے اثبات میں جواب دیا اور ٹی وی کی نیوز کا ذکر کیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''بندے کی اصلیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لڑکے نے کلینک کے سلسلے میں مجھے بہت دھوکا دیا۔ پچیس تیس ہزار روپیہ بھی لے گیا مگر زیادہ تکلیف اس ذہنی پریشانی کی ہے جو اس کی وجہ سے ہوئی۔''

نور اب تایا ابا کو کیا بتاتی کہ وہ جس دھوکے کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو اس شخص نے خود اسے دیا تھا، اپنے مطلب کے لیے اسے کھلونا بنا ڈالا تھا۔ تایا ابا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر موضوع بدلا۔ ''تمہیں پتا ہے، امنا لے کا میلا آنے والا ہے؟''

''کب؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

انہوں نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور حساب لگا کر بولے۔ ''بس تین ہفتے رہ گئے ہیں تقریباً۔ میں تو کہتا ہوں پروگرام بنا لو۔ پچھلی دفعہ بھی اچھا وقت گزرا تھا تم لوگوں کا۔''

امنا لے کا ذکر ہی ایسا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادوں کو ہانک کر دل و دماغ کے باڑے میں لے آتا تھا۔ یادوں کے اس احاطے میں سرما کی سنہری دھوپ ہوتی تھی، ڈھول کی تھاپ، گھوڑوں کے رقص، جھولے، تماشے، پکوانوں کی مہک، کشتیاں، کبڈیاں، رنگین آنچل، دلنشیں گیت...... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

نور تناؤ اور پژمردگی کے عجیب دور سے گزر رہی تھی (اس کی نوکری کی بنیاد ایتھلیٹکس پر تھی اور کسی وقت یہ نوکری بھی خطرے میں محسوس ہوتی تھی)۔ امنا لے کے نام پر اس کا دل دھڑکا اور سینے میں امنگ سی جاگی۔ اس نے کہا۔ ''تایا ابا! دل تو چاہتا ہے لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس تم پروگرام بناؤ، سب

ٹھیک ہو جائے گا۔''

''دادی اماں بھی کچھ بیمار ہیں۔'' نور نے کہا۔

''تو ان کے علاج کی بات ہی تو کر رہا ہوں میں...... دیکھنا میلے پر جانے کے لیے وہ کیسے بستر سے اٹھتی ہیں اور تیاری کرتی ہیں۔''

پتا نہیں کیوں نومبر دسمبر کے مہینے ہمیشہ سے نور کے لیے کچھ اداسی لے کر آتے تھے۔ سردی بڑھ جاتی تھی۔ شامیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ لوگ دیر تک کمروں میں بند رہتے تھے، کہرا مناظر کو ڈھانپتا تھا اور درخت بے لباس نظر آتے تھے۔ آج کل بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ کئی دن سے آسمان پر بن بارش کے بادل تھے۔ سورج شکل نہیں دکھا رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آج اسے پریکٹس کے لیے جانا تھا مگر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کمبل اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا وا کیا۔ باہر باغیچے میں حسینیں کے پودے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کیاریوں میں گیندے اور چائنا روز کے پھول بھی جیسے سردی سے سکڑے سمٹے تھے۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جو دو دن پہلے اس نے اور مہرین نے شاہراہ قائداعظم کے ریستوران میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا جلوس جو نعرے لگاتا اور کتبے لہراتا کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس میں سے سب آگے وہ تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا مکا فضا میں لہراتا اور نعرہ بلند کرتا تھا...... پاکستان کا مطلب کیا؟ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سچائی تھی جو اپنے موقف کے حوالے سے اس کے اندر موجود تھی۔ اپنی تمام تر سخت گیری کے باوجود وہ کھرا مخلص دکھائی دیتا تھا...... اور اس کی بہن خدیجہ نے کہا تھا کہ وہ اندر سے اخروٹ کے مغز کی طرح نرم ہے۔ یہ ایک بہن کے تاثرات ایک بھائی کے بارے میں تھے اور ابھی تایا ابا نے کہا تھا...... حقیقت کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی انسان سے مستقل طور پر واسطہ پڑتا ہے۔

خدیجہ کی کہی ہوئی باتیں نور کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلی اور آخری بار کہے گی اور واقعی تب سے اب تک اس نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی بلکہ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اب تک ان کی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے کہا تھا...... نور، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ کوئی عارضی یا سطحی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے...... تمہارے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

نور نے ایک آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ خدیجہ کی باتوں کے حوالے سے وہ کبھی کبھی بے چین سی ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی واقعی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی آس لگائے بیٹھا ہے، اس کی نسبت سے کسی انہونی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

وہ کیوں کر رہا تھا ایسا؟ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا؟ نور کو اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ جیسے اندر سے جھنجلا سی گئی۔ وہ کیوں یہ بات سمجھ نہیں جاتا کہ نور کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور مختلف سوچوں کے انسان ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے...... اور انہیں ملنا بھی نہیں چاہیے۔

پتا نہیں کیوں نور کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اس سے بات کرے...... ٹیلی فون پر ہی سہی مگر اس سے رابطہ کرے۔ اسے سمجھائے کہ وہ کسی انہونی کی آس نہ لگائے۔ جو وہ سوچ رہا ہے، کبھی نہیں ہوگا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن جلد از جلد اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ان کا دل نہ دکھائے۔

یہ عصر کا وقت تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں لے کے میلے پر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے بھی اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے اپنی کالونی کی مارکیٹ تک جانا تھا۔ اس نے گرم شال لی۔ اونی ٹوپی پہنی اور شولڈر بیگ لے کر قریبی مارکیٹ کو چل پڑی۔ اس کے پاس ذوالقرنین کی دکان کا نمبر موجود تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس وقت وہ دکان پر ہی ہوگا۔

وہ ایک پی سی او یا کس کے اندر چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ٹھوس بے لچک لہجے میں وہ سب کچھ کہہ دے گی جو اس نے سوچ رکھا ہے اور بات کو مزید طول دیے بغیر فون بند کر دے گی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنا شروع ہوئی پھر فون اٹھایا گیا۔ اردو بازار کا شور کانوں میں گونجا، تب ذوالقرنین کی بھاری مگر ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ ''ہیلو...... ہیلو...... کون؟''

پتا نہیں یہ کیسے لمحے تھے۔ نور کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ وہ جو نہایت روکھے پھیکے لہجے میں ذوالقرنین کی مکمل حوصلہ شکنی کا ارادہ رکھتی تھی، ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد آواز دوبارہ ابھری۔

''ہیلو،کون بول رہا ہے؟کس سے بات کرنی ہے؟''

نور نے ایک بار پھر کوشش کی مگر گلے میں پھندا سا تھا۔کبھی نہ گھبرانے والی اور شدید ترین تناؤ میں بھی خود کو یکسو رکھنے والی نور منتشر سی ہوگئی تھی۔ اس نے ریسیور کو مضبوطی سے تھاما۔کچھ کہنے کے لیے [illegible] مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دم ریسیور [illegible] دیا گیا۔

وہ قریباً ایک منٹ تک وہاں گم صم کھڑی رہی پھر [illegible] نکل آئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔اس کے ذہن میں ابھی تک ہلچل تھی۔وہ یونہی گارمنٹس کی ایک دکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور شوکیس میں جھانکنے لگی۔اس نے اپنے دل کو سخت کرنا چاہا۔شعوری طور پر ذوالقرنین کی وہ ساری باتیں یاد کیں جو اسے بری لگتی تھیں۔اس کا Tipical لباس،اس کا بے لچک لب و لہجہ،اس کی گھنی بھویں جنہیں وہ غصے کے وقت اچکاتا تھا اور اس کا وہ رویہ جو خواتین کو کھیل کے میدان اور اس طرح کی دیگر مصروفیات سے دور رکھنے کے حوالے سے تھا۔

وہ ایک بار پھر پی سی او کے کیبن کی طرف بڑھی۔ایک خاتون اپنی بات ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔نور اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔اس نے ریسیور اٹھایا۔اچھی طرح کھنکھار کر گلا صاف کیا۔دل ایک بار پھر شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔اس نے ہمت کر کے ڈائل پر انگلی رکھی......لیکن......آدھا نمبر ڈائل کرنے کے بعد ہی ایک بار پھر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔وہ بے خوف لڑکی تھی اور دل کی بات کہہ دیا کرتی تھی لیکن آج پتا نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

ذوالقرنین اپنی شاپ پر گم صم بیٹھا تھا۔ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اسے ایک فون کال آئی تھی۔اس نے ریسیور اٹھا کر کئی بار ہیلو کہا تھا مگر جواب ندارد تھا بس سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔تب اس نے دوبارہ پوچھا تھا کہ کون بول رہا ہے۔آواز اس مرتبہ بھی نہیں آئی تھی۔ہاں کسی کلائی کے بینگل ٹکرانے کی مدھم صدا ضرور ابھری تھی اور فون بند کر دیا گیا تھا۔پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ فون کسی اور کی طرف سے نہیں،نور یا اس کی تایا زاد بہن مہرین کی طرف سے تھا۔زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ نور کی طرف سے ہوگا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔اگر وہ نور ہی تھی تو کیا کہنا چاہتی تھی؟ذوالقرنین کے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ خدیجہ کالج گئی ہوئی ہے۔وہاں فیئر ویل کی ایک تقریب تھی۔وہ جب بھی کسی ایسی تقریب میں جاتی تھی،ذوالقرنین کو تشویش ہونے لگتی تھی۔چند مہینے پہلے ایک ایسی تقریب میں ہی تو خدیجہ کا بازو ٹوٹا تھا اور چوٹیں لگی تھیں۔خدا کا شکر تھا کہ اب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔نشو بجلی یا اس کے گروپ کی طرف سے کم از کم اب تک تو کوئی [illegible] خالی نہیں ہوئی تھی۔پھر بھی ذوالقرنین کو ایسے موقعوں پر [illegible] جاتا تھا۔اس نے گھر فون کیا۔والدہ نے بتایا [illegible]۔وہ فوراً بے چینی سے دکان کے اندر ہی ٹہلنے لگا [illegible] فون کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری طرف خدیجہ ہی تھی [illegible] بولا۔

''واپسی میں دیر لگائی ہو تو کسی طرح [illegible] تمہیں معلوم ہے تمہارا بھائی پنجوں پر کھڑا ہو کر تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہے۔''

''سوری۔بس رش کی وجہ سے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔تم نے فون کیا تھا؟''

''ہاں،تمہاری واپسی کا پوچھنا تھا......اور ایک دوسری بات بھی کرنا تھی۔''

''دوسری بات؟کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی؟''اس نے حسب عادت چھیڑا۔

''دیکھی تو نہیں سنی ہے......اور مجھے لگتا ہے کہ وہ نور ہی تھی۔''

وہ چونک کر بولی۔''کیا مطلب......کوئی......فون آیا تھا؟''

''ہاں،آیا تو فون ہی تھا مگر دوسری طرف سے صرف سانسوں کی آواز ہی آ رہی تھی۔''

''اور سانسوں کی آواز سے جناب کو پتا چل گیا کہ وہ نور تھی؟''

''ہاں۔میرے اندازے کے مطابق یہ فون اس مارکیٹ سے کیا گیا تھا جس کے پاس انکل اشفاق کی رہائش ہے۔اب تم پوچھو گی کہ یہ نتیجہ میں نے کیسے نکالا؟''

''بالکل۔بات تو پوچھنے والی ہے۔''

''مارکیٹ کی جامع مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔میں وہاں کے مؤذن عبید اللہ صاحب کو اور ان کی اذان کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔وہاں کئی بار جمعہ بھی پڑھا ہے،کیا سمجھیں؟''ذوالقرنین معنی خیز لہجے میں بولا۔

''تمہیں تو سی آئی ڈی میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔''خدیجہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔''لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے نا کہ وہ نور ہی ہو۔''

''میرا قیافہ تو یہی ہے کہ وہ نور یا مہرین میں سے کوئی

ایک تھی۔ باقی واللہ علم بالصواب۔" تھوڑے سے توقف
کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔" خدیجہ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم
ایک بار اور اس سے مل لو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو
لیکن کہہ نہ پارہی ہو۔"

"نہیں ذوالقرنین، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ
اس حوالے سے پہلی اور آخری بار اس سے بات کر رہی ہوں۔
میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتی ہوں...... اور...... ویسے
بھی ذوالقرنین! سیانے کہتے ہیں کہ محبت کو آزاد چھوڑ دینا
چاہیے، بغیر شرط کے...... بغیر کسی بندھن کے...... اگر وہ واقعی
محبت ہوگی تو کسی نہ کسی طور آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ ہم
نے اس سے جو بھی کہنا ہے کہہ دیا ہے۔ اب انگریزی کے
محاورے کے مطابق گینداس کی کورٹ میں ہے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فون پر اس نوع کی مزید گفتگو
مناسب نہیں تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو محسوس
کرکے خدیجہ نے کہا۔" آج کیا تاریخ ہے؟" ذوالقرنین
نے بتایا کہ گیارہ ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔
"کچھ یاد آیا تمہیں؟ آٹھ دس دن بعد امنالے کا میلا آنے
والا ہے۔ پچھلے سال نور کے اباجی نے تمہیں میلا دیکھنے کی
دعوت دی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اس بار ہوآؤ وہاں سے......
ہوسکتا ہے کہ کوئی اچھی بات ہوجائے۔"

"میرے خیال میں تو یہ بے کار کی باتیں ہیں......"
شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر لائن میں شور اور کھڑکھڑاہٹ
شروع ہوگئی۔

اس نے فون بند کردیا۔ دل میں ایک بے قراری سی
تھی۔ اگر وہ واقعی نور یا مہرین کی کال تھی تو ہوسکتا تھا کہ
دوبارہ کال آتی کل یا پرسوں...... یا ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر
بعد۔ اس نے سیاہ رنگ کے فون سیٹ کا ریسیور اچھی طرح
کریڈل پر جمایا اور جیسے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف
دیکھنے لگا۔

وہ کیوں اسے بھول نہیں پاتا؟ کیوں ہر گھڑی اس کا
انتظار رہتا ہے؟ وہ کوئی عاشق مزاج کالجیٹ لڑکا نہیں
تھا...... وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔
اس کے گھرانے کی پہچان تھی۔ لوگ ان کی نجابت کی
مثالیں دیتے تھے اور جو کچھ ہوا اس میں ذوالقرنین کا کوئی
قصور بھی نہیں تھا۔ نور اس کی سوچوں اور نظروں میں آنے
والی پہلی لڑکی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ اس
کے والدین نے اسے ذوالقرنین کے لیے پسند کیا تھا۔ نور
اس کو دکھائی گئی تھی۔ اس کی باتیں اسے بتائی گئی تھیں۔
ذوالقرنین کے دل میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی اور جب
جھکی جھکی نگاہوں والے خاموش طبع ذوالقرنین کے دل میں
اس کی جگہ بن گئی تھی تو سب الٹ پلٹ ہوگیا تھا اور اب وہ
بے پناہ کوشش کے باوجود اس کی سوچوں سے چھٹکارا
حاصل نہیں کر پارہا تھا۔ بے شک وہ اس کے مزاج کی نہیں
تھی، بے شک اس کی مصروفیات ذوالقرنین کو پسند نہیں تھیں
لیکن وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت ایسی ہی بے دلیل
اور منہ زور ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے اور اپنے اصول
ضابطے خود مقرر کرتی ہے۔

ایک گاہک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔
"بیٹا ذوالقرنین! سیرت امام زین العابدین ہوگی آپ کے
پاس؟" یہ ایک قریبی مدرسے کے استاد تھے اور ذوالقرنین
کے پرانے کسٹمر۔

"جی سر! ایک کاپی موجود ہے۔ اوپر پڑی ہے، میں
دیکھتا ہوں۔" ذوالقرنین نے کہا اور سیڑھی چڑھ کر دکان
کے بالائی حصے کی طرف گیا۔ ابھی وہ پانچ چھ سیڑھیاں ہی
چڑھا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ وہ بڑا باتحمل نوجوان تھا
مگر گھنٹی کا بجنا اور نور کا خیال ذہن میں آنا اتنا ہی ہیجان خیز تھا
کہ وہ جلدی سے پلٹا۔ شلوار کے پائنچے میں اس کا پاؤں الجھا
اور وہ چار پانچ زینوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے سر پر
ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی اور ناک سے خون رسنے لگا۔ کہنیوں
پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے قریبی کلینک میں پہنچایا
گیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور تسلی دی۔ اس کی ایک آنکھ خون
کی طرح سرخ ہوگئی تھی۔ پیشانی پر پٹی بندھوا کر اور انجکشن
وغیرہ لگوا کر وہ دوبارہ دکان پر آگیا۔

اردگرد کے دکاندار حال احوال پوچھنے کے لیے جمع
ہوگئے۔ ایک نے کہا۔" یار! تم تو ہمارے بازار کے سب
سے رکھ رکھاؤ والے دکاندار ہو، دکان میں دو سیلز مین موجود
تھے پھر خود کیوں سیڑھی چڑھ گئے اور اگر چڑھ ہی گئے تھے تو
پھر چھلانگ کیوں لگادی؟"

دوسرے نے کہا۔" کوئی ضروری فون آگیا تھا۔
جناب پلٹے تو گرگئے۔"

ایک بے تکلف ہمسائے نے کہا۔" کوئی اور ہوتا تو
اس بات کا بھی بتنگڑ بنتا کہ ایسا کون سا ضروری فون تھا مگر
بھئی، تم پر شک کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی میاں مٹھو پر شک
کیا جائے کہ وہ رات کو مرغ کی طرح اذان دیتا ہے۔"

دوست ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے اور وہ اپنے
اندر ہی اندر بے پناہ خجل ہورہا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں بتایا گیا

تھا۔ اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے ایک پڑوسی دکاندار کو ساتھ لیا اور اپنی ایف ایکس خود ہی ڈرائیو کر کے گھر چلا گیا۔

......اگلے روز رات کو اسے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ تسلی کے لیے سی ٹی اسکین وغیرہ بھی کرالیا گیا۔ او کے رپورٹ ملی۔ ڈاکٹر نے کہا دو تین دن تک بخار چلے گا...... اگلے روز بخار نسبتاً کم تھا مگر غنودگی بدستور تھی۔ رات کو ذوالقرنین کے کمرے میں خدیجہ تیمارداری کے لیے موجود تھی۔ رات گئے بخار کی مدہوشی میں ذوالقرنین نے دو تین بار کچھ کہا۔ خدیجہ نے اٹھ کر سنا۔ اس کا بھائی بہت مدھم آواز میں دلفگار لہجے میں "نور" کا نام لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے نور سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب بھی اس سے اپنے بھائی کے حوالے سے بات نہیں کرے گی اور وعدہ ایفا کرنا خدیجہ کی خوتھی لیکن وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ مہرین کو فون کرتی اور اسے ذوالقرنین کی چوٹ کے بارے میں بتاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مہرین رات کو دیر تک جاگتی ہے۔ اس کو فون کرنے کے لیے وہ فون سیٹ کے پاس آن بیٹھی۔ دل و دماغ میں کشمکش سی تھی۔ کافی دیر تک فون کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کے بعد وہ نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ کچھ باتوں کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

نور کمرے میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ نئی ملازمہ ابھی ابھی کمرے میں صفائی کر کے گئی تھی۔ چاندی نام تھا۔ بہ مشکل پچیس چھبیس سال کی رہی ہوگی۔ قبول صورت تھی لیکن بڑی بجھی بجھی اور ڈری ڈری سی۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا، تھوڑا سا لنگڑاتی بھی تھی۔ کل تائی امی نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر پچپن سال سے زیادہ عمر کا ہے اور اس کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔

تائی امی کمرے میں آئیں تو نور نے پوچھا کہ یہ کیوں اس کی مار کھاتی ہے؟

تائی بولیں۔ "دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں۔ راجن پور کے آس پاس۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔"

"وہ کیوں؟"

"کوئی لمبا چکر تھا۔ اس کے بھتیجے نے کسی لڑکی کو بھگایا تھا۔ لڑکی والوں نے پنچایت بلائی۔ ایسی پنچایتوں میں بڑے بڑے منحوس فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ملزم لڑکے کی بہن کی شادی لڑکی کے باپ سے کر دی جائے لیکن دوسری پارٹی نہیں مانی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی مشکل سے چودہ پندرہ سال کی۔"

"تو پھر؟"

"پھر ملزم پارٹی نے آفر کی کہ ہم لڑکے کی چھوٹی پھوپی چاندی کا رشتہ دے دیتے ہیں۔ چاندی بھی اچھی شکل کی تھی مگر اس کو پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اس بار مدعی پارٹی نہیں مانی۔ انہوں نے کہا ہمیں کنواری کے بدلے کنواری چاہیے۔ اندازہ لگاؤ ان لوگوں کی جاہلیت کا۔ مرد عورت کا رشتہ کتنا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ اسے بدلے کی آگ سے گھناؤنا اور مکروہ بنا دیتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" نور نے پوچھا۔

"وہی سودے بازی۔ معتبر لوگوں کے بیچ میں پڑنے سے مدعی پارٹی چاندی کے رشتے پر مان تو گئی مگر ساتھ میں دو بھینسوں اور نقد رقم کی صورت میں بہت سا جرمانہ بھی وصول کیا۔ اب یہ بے چاری اپنے سے دوگنا عمر کے شوہر کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ وہ پکا جواری ہے، بہت کچھ ہار چکا ہے۔ اب گھر میں پڑا اینٹھتا ہے۔ یہ بے چاری گھروں میں کام کرتی ہے۔"

"یعنی اپنے بھتیجے کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے؟"

"بالکل۔ ایسی کہانیاں ہمارے دیہاتوں اور گوٹھوں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں نور...... کنواری کے بدلے کنواری۔ بیاہتا کے بدلے بیاہتا۔ یا ایک کنواری کے بدلے دو بیاہتا...... سن کر اور دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم پتھر کے زمانے میں بستے ہیں اور ہم پر جنگل کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔"

"ایسا قانون جس میں مردوں کے کیے ہوئے کی سزائیں بھی صرف عورتوں کو ہی ملتی ہیں۔" نور نے تائیدی انداز میں کہا۔

"بالکل...... اب یہی چاندی والا معاملہ ہی دیکھو۔ اس کا کیا قصور تھا؟ یہ بیٹھی بٹھائی اس گھیرے میں آ گئی۔ لڑکے کی پھپو کی حیثیت سے اسے قربانی دینا پڑی۔ اچھی صورت کی تھی، جوان تھی، بھگائے جانے والی لڑکی کا کوئی جوان بھائی یا چچا وغیرہ ہوتا تو اس کے پلے باندھ دی جاتی۔ کوئی ایسا نہیں تھا اس لیے لڑکی کے کھوسٹ باپ نے یہ جرمانہ وصول کیا اور اسے اپنے گھر ڈال لیا۔"

نور آہ بھر کر رہ گئی۔

اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نور نے دیکھا، یہ فون انہی چھوٹی لڑکیوں کی طرف سے تھا جن سے ایک دن ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے ایتھلیٹکس کے حوالے سے ہی بات کرنا تھی۔ آج کل نور کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرے یا اس بارے میں سوچے۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی۔ تیسری بار بیل ہوئی تو نور نے کال ریسیو کر لی۔ بچیوں کی والدہ بول رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے نور نے خوش خلقی سے بات کی۔

بچیوں کی والدہ صباحت بولی۔ ''نور! تم میری بچیوں کی آئیڈیل ہو۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی لے رہی ہیں رننگ میں۔ اس حوالے سے میں تم سے دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی کہیں۔''

''میں ایک بڑی بہن کی طرح تم سے آزادانہ بات کر سکتی ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی ایک دینی رجحان والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے نور کہ بچیاں پُروقار طریقے سے اور اپنے حجاب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی صحت مند تفریحات میں حصہ لے سکیں؟''

''یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے صباحت صاحبہ لیکن جو کچھ میری ادنیٰ سمجھ میں آیا تھا، وہ میں نے ایک اخباری انٹرویو میں بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ آپ......''

''ہاں۔ وہ انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔'' صباحت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہاری کچھ باتیں ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ اس میں تم نے ایک لباس کا آئیڈیا بھی پیش کیا تھا جو لڑکیاں اور خواتین رننگ کے وقت پہن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے نور، خواتین کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جنہیں کسی بھی طرح نمایاں نہیں ہونا چاہیے اور مردوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔''

''جی ہاں۔ اس لباس میں، میں نے یہی چیز مد نظر رکھی تھی۔ بہت سی نئی لڑکیوں نے اسے اپنایا ہے اور مفید پایا ہے۔''

''نیکر کے بجائے غالباً ٹراؤزر قسم کی چیز تھی۔'' صباحت نے کہا۔

''ہاں لیکن زیادہ کھلا ٹراؤزر نہیں اور کپڑا بھی ہلکا پھلکا لچکدار اور ملائم ہو۔ جو سامنے سے ہوا کی مزاحمت نہ کرے۔ لباس کا اپر کولہوں سے نیچے تک جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے بھی آپ کے جسم کے ساتھ رہتا ہے، سامنے کی طرف دو ایک جگہ ہلکی پھلکی پیکنگ ہے جو باڈی کی شیپ کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہیں گی تو میں آپ کو انٹرویو کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا دوں گی۔ تفصیل سے دیکھ لیجیے گا......'' اب وہ پیچھا چھڑانے کے موڈ میں تھی۔

بہتر ہوا کہ دوسری طرف کوئی بچہ رونے چلانے لگا اور صباحت نے کہا۔ ''اچھا نور! چھوٹا بیٹا رو رہا ہے، پھر بات کریں گے۔''

نور کو یہ ساری گفتگو بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے، سہ پہر اور شام کے درمیان ایک کمزور سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

نور کمرے میں بیٹھی تھی۔ مہرین لپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ''مبارک ہو بھئی۔ کوئی مٹھائی وغیرہ ہونی چاہیے۔'' نور کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے لگا جیسے شاید اس کے حوالے سے کوئی اچھی خبر ہے۔ واپڈا والی نوکری خطرے میں دیکھ کر اس نے دو تین اور جگہوں پر ٹرائل دے رکھے تھے۔ اس نے سمجھا شاید کہیں سے کوئی لیٹر آیا ہے مگر مہرین کی مبارک دوسرے حوالے سے تھی، اس نے کہا۔ ''آل پنجاب تقریری مقابلے میں گولڈ میڈل جیتا ہے بسمہ نے...... تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہوئی؟''

بسمہ کی کامیابی کا سن کر نور کا دل بلیوں اچھل گیا، مہرین کہہ رہی تھی۔ ''مجھے تو دوپہر ایک بجے ہی پتا چل گیا تھا، میں نے سمجھا تم تک بھی خبر پہنچ چکی ہوگی۔''

خوشی کے اس موقع پر نور کو اپنے سینے میں کچوکا سا محسوس ہوا۔ شام ہونے کو آئی تھی اور وہ ابھی تک اپنی بہن کی اتنی اہم کامیابی سے بے خبر تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی، ابا جان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، ان کے سبب دونوں گھروں میں اطلاعات کا تبادلہ کم ہی ہوتا تھا۔ ابا جان نے ابھی تک ٹیلی فون بھی نہیں لگوایا تھا۔

ابھی نور اور مہرین باتیں ہی کر رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف بسمہ تھی، کسی پی سی او سے بات کر رہی تھی۔ ''نور! میں نے گولڈ میڈل جیت لیا۔'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

''ہاں...... مجھے ابھی پتا چلا ہے مہرین سے۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' وہ بولی۔

نور کے لہجے میں اداسی کی جھلک کو بسمہ نے فوراً نوٹ کیا۔ بولی۔ ''ویری سوری نور! میں تمہیں دوپہر کو ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی مگر ابا جان اور چھوٹی امی ساتھ تھیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔''

"چلو کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو تمہارا فون نہیں آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ فائنل آج نہیں ہوگا۔"

"بس اب جلدی سے گھر آجاؤ۔ اکٹھے "سیلیبریٹ" کریں گے، آپی بتول بھی آئی ہوئی ہے۔"

"ابا جان کا موڈ کیسا ہے؟" نور نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ نہ بھی ہو تو چھوٹی امی ہیں نا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نور اور مہرین کو بلالو۔"

اسی دوران میں رابطہ منقطع ہوگیا۔ بہرحال ضروری بات ہوگئی تھی۔ نور کو امید تھی کہ ابھی پھپھو یا چھوٹی امی میں سے کوئی آئے گا اور نور کو اپنے ساتھ لے جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رات گزر گئی، اگلا روز بھی گزر گیا۔ اگلے روز شام کو تایا ابا گھر آئے تو انہوں نے نور کو بتایا۔ "بھئی آج دعوت پر چلنا ہے۔"

"کہاں؟" نور نے پوچھا۔

"تمہارے گھر اور کہاں؟ بسمہ کی کامیابی پر تمہارے ابا جان نے کافی بڑا فنکشن کرڈالا ہے۔ پاس کے سارے رشتے دار آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے جہاں بسمہ کے رشتے کی بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی آئیں گے۔"

"ہمیں تو کسی نے نہیں بتایا۔" مہرین نے کہا۔

"چلو اب میں جو بتا رہا ہوں، تیار ہوجاؤ۔ نو بجے تک پہنچنا ہے۔"

نور کو سینے میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ ابا جان کی طرف سے بسمہ کی کامیابی پر خوشی کا یہ غیر معمولی اظہار اسے دکھانے کے لیے بھی ہے۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتے ہوں اور تایا ابا کو بھی بتانا چاہتے ہوں کہ یہ ہوتی ہے کامیابی اور یوں ملتا ہے والدین کی فرمانبرداری کا صلہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ نور اپنی بہن کی کامیابی پر خوش نہیں تھی۔ اس کی کامیابی کا سن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائی سے خوشی کے سوتے پھوٹے تھے مگر ابا جان اور دیگر اہلِ خانہ کے رویے نے اسے تھوڑا سا افسردہ کیا تھا۔

تقریب میں کافی مہمان تھے۔ بسمہ کے ہونے والے سسرالی بھی آئے تھے۔ باقاعدہ کیک کاٹا گیا اور بسمہ کی کامیابی کو سیلیبریٹ کیا گیا۔ بسمہ کے متوقع سسرالیوں سے ابھی تک نور کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک انکل نے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بیٹی کون ہے؟"

دادی نے کہا۔ "چھوٹی پوتی ہے میری۔ پچھلی دفعہ کہیں گئی ہوئی تھی، آپ سے نہیں ملی ہوگی۔"

"اچھا یہ وہی ہیں جو ریس وغیرہ میں بھی حصہ لیتی ہیں۔" انکل نے اپنی نیم سفید ریش میں انگلیاں چلا کر ذرا چبھتے لہجے میں کہا۔

"ایک مرتبہ.....شاید گر بھی گئی تھیں، تصویریں وغیرہ آئی تھیں۔" ایک لڑکی بے ساختہ بول اٹھی۔

تایا ابا نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو بس گرنا یاد رہ گیا، کچھ اور یاد نہیں آیا۔ یہ صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں کئی بار وکٹری اسٹینڈ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا کمرا ایوارڈز اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے....."

بسمہ کے ہونے والے دیور نے کہا۔ "دراصل انکل! کرکٹ کا کھیل باقی سب کھیلوں کو کھا گیا ہے، ان بے چارے ہاکی والوں کو ہی دیکھ لیں۔ قومی ٹیم میں آکر ریٹائرڈ بھی ہوجاتے ہیں لیکن ہم انہیں شکلوں سے نہیں پہچانتے۔ کچھ کے تو نام بھی معلوم نہیں ہوتے اور جب ہاکی جیسے قومی کھیل کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا پوچھنا۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" تایا ابا نے دفاع کیا۔ "بے شک کرکٹ بہت حاوی ہوچکی ہے مگر دیگر کھیلوں کے پرستار بھی موجود ہیں۔"

"چلیں جی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ ویسے بھی لڑکی والوں سے ہمارا بحث کرنا تو بنتا ہی نہیں ہے۔" بسمہ کے ہونے والے سسر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

نور کو یہاں بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی، وہ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کا اٹھنا ہی بہتر تھا کیونکہ ابا جان کو بھی اس کی موجودگی زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے نئے رشتے داروں سے اسے اور اس کے شوق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

وہ دیر تک بسمہ کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں کھانا کھائے بغیر ہی واپس تایا ابا کے گھر آگئی۔

تایا ابا کو ساری صورتِ حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بے شک بسمہ نے اہم کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کو جس طرح سیلیبریٹ کیا گیا تھا، اس میں ایک طرح کی مسابقت بھی شامل تھی۔ تایا ابا کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ اشفاق نے اس گیٹ ٹوگیدر کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اور ان لوگوں کو بالکل آخر وقت میں اطلاع دی تھی۔ اس کا جواب دینے کا موقع بھی تایا ابا کو جلد ہی مل گیا۔

مہرین فزیوتھراپی کے دوسرے سال میں تھی، اس نے فزیوتھراپی میں نئے رجحانات اور اسپورٹس میں ان کے

اطلاق کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلینڈ کے ایک اچھے میڈیکل میگزین میں بھی شائع ہوا اور اسے طبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ انگلش جریدے کی طرف سے مہرین کو معقول معاوضہ اور تعریفی... سرٹیفکیٹ بھی موصول ہوا۔ تایا خلیل نے بھی نامعقول اشفاق کو جواب دینے کے لیے فوراً ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ یہ تقریب بھی گھر میں ہوئی اور اس میں کافی مہمان شریک ہوئے۔ اپنی دونوں بہنوں کی کامیابی پر نور دل کی گہرائی سے خوش تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ دونوں تقاریب اس کے لیے بوجھل ثابت ہوئیں۔ اس نے خود کو بالکل سائڈ لائن پر محسوس کیا۔ اب بھی کبھی اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید اس نے واقعی اپنے لیے ایک غلط لائن منتخب کر لی تھی۔ یہ اس کا میدان ہی نہیں تھا یا پھر میدان تو تھا لیکن وہ درست طور پر اس میں داخل نہیں ہوئی تھی، جب وہ داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک بددعا تھی اور یہ بددعا کسی اور نے نہیں اس کے والد نے دی تھی۔

دو تین روز بعد جب نور ایف اے ایس میں پریکٹس کے بعد گھر واپس آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا، ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس محکماتی لیٹر میں بڑے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے نور کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا۔

اسے ہمت نہیں ہوئی کہ تایا ابا کو بتاتی تاہم اس نے مہرین کو بتا دیا۔ ''یہ سراسر ناانصافی ہے۔'' مہرین نے تڑخ کر کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ اس سلسلے میں بھی نشو بکلی کا گروپ کام کر رہا ہے۔''

''نہیں بھئی، ہمیں ہر معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔''

''تو پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے نور! تم اب فٹ ہو، باقاعدگی سے رننگ بھی کر رہی ہو۔ میڈم فرحانہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری یہی روٹین رہے تو تم دو تین ماہ میں پہلے والی فارم حاصل کر سکتی ہو۔''

وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی اور جوتے اتار کر دور پھینک دیے۔ بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ میں کسی اور سے نہیں اپنی قسمت سے لڑ رہی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ مہرین جواب میں کچھ کہتی تایا ابا کی آواز آئی۔ ''کہاں ہو لڑکیو! میں ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔''

نور نے جلدی سے کہا۔ ''تایا ابا کو جاب کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

مہرین نے اثبات میں سر ہلایا۔

تایا ابا کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے جو وہ درزی سے لے کر آئے تھے۔ یہ نور اور مہرین کے دو دو سوٹ تھے جو انہوں نے امنالے کے میلے پر لے کر جانے تھے۔ ایک زرق برق سوٹ تائی امی کا بھی تھا۔ وہ ہمیشہ سے خوش لباس تھیں اور دادی اماں کے طعنے ان کی خوش لباسی پر کبھی کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی (پڑھی لکھی ہونے کے باوجود) امنالے کے میلے کا شدت سے انتظار کرتی تھیں۔

تایا ابا نے کہا۔ ''پرسوں صبح سویرے روانگی ہے، جو کام نمٹانے ہیں آج نمٹا لو۔ میں ذرا گاڑی کا تیل فلٹر بدلوانے جا رہا ہوں۔''

وہ چلے گئے۔ نور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مہرین نے بے تکلفی سے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''باجی جان! موڈ ٹھیک کریں اپنا زندگی میں اونچ نیچ چلتی رہتی ہے کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ سب اچھا ہو جائے گا، آپ بس تیاری فرمائیں۔''

''پتا نہیں کیوں دل بجھ سا گیا ہے مہرین۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تیاری فرمائیں۔ چند دن کے لیے آب و ہوا تبدیل ہوگی، ماحول تبدیل ہوگا تو جناب کے دماغ میں جھاڑو پھیرے گا اور کافی کچرا شچرا نکل جائے گا۔''

وہ دیر تک نور کو قائل کرتی رہی اور آخر کافی حد تک کامیاب ہو گئی، یقیناً ابا جان بھی جا رہے تھے اور یہ آس ہمیشہ نور کے دل میں موجود رہتی تھی کہ شاید ابا جان کے قریب رہنے سے کسی وقت کوئی ایسا موقع بھی مل جائے جو ان کی دوریاں ختم کر دے۔ انا اور بیگانگی کی وہ بلند دیوار گر جائے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

اگلے روز نور اور مہرین بھی دیگر لڑکیوں کے ساتھ روانگی کی تیاری میں لگ گئیں۔ نور اور مہرین نہیں جانتی تھیں...... بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ ان کا یہ سفر کتنا تہلکہ خیز ثابت ہونے والا ہے۔ کچھ حالات ''ماحول کے ہم رنگ سانپوں'' کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں گھات لگائے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان کے اندر زہر پنپتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں...... اور آخر جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ سانپ موجود تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

امنالے کا میلا تو خوشی کا باعث ہوتا ہی تھا۔ اس کی

تیاریاں بھی خوشی و شادمانی کے زمرے میں آتی تھیں......
تیاری مکمل تھی اور اب سفر درپیش تھا۔ ایک اسٹیشن ویگن اور تین گاڑیاں لاہور سے گجرات کی طرف روانہ ہو رہی تھیں۔ شرجیل، عثمان، مہرین اور نور اسٹیشن ویگن میں تھے۔ ابا جان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر مہرین، بسمہ کو کھینچ تان کر اسٹیشن ویگن میں لے آئی تھی۔ اس نے آپی بتول کو بھی آنے کا کہا تھا مگر وہ ابا جان اور چھوٹی امی زلفت کے ساتھ ٹویوٹا گاڑی میں رہی تھیں۔ خوشی کے موقع پر نور بھی سب میں گھل مل جایا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو دوسروں میں مکس نہیں کر پا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان چار پانچ روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا جاتا تھا۔ آخر وہ ذوالقرنین سے بات کیوں نہیں کر پائی تھی؟ کیوں اس کی غلط فہمیاں دور کرنے میں ناکام رہی تھی؟ کیا وہ واقعی غلط فہمیاں ہی تھیں؟ یہ سوال اسے اندر سے لرزا دیتا تھا۔ وہ جس شخص کو پسند ہی نہیں کرتی تھی اس سے دوٹوک بات کرنے میں کیا چیز مانع آ گئی تھی؟ اسے جیسے اپنی ہی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اس کی پژمردگی کی دوسری وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس کی ڈیپارٹمنٹل جاب ختم ہو گئی تھی اور اپنی پریکٹس وغیرہ جاری رکھنے کے لیے اس پر اضافی بوجھ پڑنے والا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے شاید وہ مستقبل میں پوری تندہی کے ساتھ رننگ پریکٹس جاری ہی نہ رکھ سکے۔ ان باتوں کے علاوہ ابا جان کا رویہ بھی اسے مسلسل ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں معافی یا رحم کی کوئی رمق اسے نظر نہیں آتی تھی۔

دادی اماں علیٰحدہ گاڑی میں پھپھو حاجرہ اور خالہ عریفہ کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ گاڑی ماموں مراد ڈرائیو کر رہے تھے۔ دادی اماں پچھلی نشست پر تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ان کی دواؤں والا شاپر بھی ان کے سرہانے رکھا تھا اور پھپھو اس شاپر کی حفاظت پر مامور تھیں۔

سفر ہنسی خوشی کٹا۔ گجرات سے آگے پھالیہ کے نواح میں دوپہر کا کھانا ایک آب جو کے کنارے کھایا گیا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ، ہلکی ہوا میں دور تک جھومتی ہوئی فصلیں اور درختوں کے تالیاں بجاتے ہوئے پتے۔ یہ ان لوگوں کا بچھڑا ہوا ماحول تھا اور اس ماحول میں آ کر وہ سب عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

موراں والی گاؤں پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہو گئی۔ میلے کے آثار گاؤں کے نواح سے ہی شروع ہو جاتے تھے۔ بہت سے شامیانے لگ چکے تھے۔ کچھ لگائے جا رہے تھے۔ جھولوں کی تنصیب ہو چکی تھی۔ سرکس اور تھیٹر کی تزئین و آرائش کا کام تیزی سے جاری تھا۔ مٹھائیوں، سموسوں اور گلگلوں کی جانی پہچانی خوشبو دور ہی سے ان سب کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ گاؤں میں بھی سب کو معلوم ہو گیا کہ مہرا گھرانے کے لوگ بھی پہنچ گئے ہیں۔ اہلِ دیہہ کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔

گاؤں والی رہائش گاہ تو اب مکمل طور پر فروخت ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کا قیام اس پرانی حویلی میں تھا جو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بارشی نالے کے کنارے واقع تھی۔ دریا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حویلی تک جانے کے لیے ایک نیم پختہ رستہ بنا دیا گیا تھا۔ اشفاق مہرا اور خلیل مہرا کی آمد سے پہلے ہی اس حویلی کو بالکل تیار کر دیا گیا تھا۔ رنگ و روغن ہوا تھا۔ لان اور درختوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ کچن کا سامان بھرا گیا تھا اور دیگر ضروریات فراہم کی گئی تھیں۔ موراں والی سے آگے ایک زمیندار کے ڈیرے تک ٹیلیفون کی لائن آ چکی تھی۔ وہاں سے آگے قریباً ایک کلومیٹر تک خلیل مہرا نے اپنے خرچے پر فون لائن کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس مرتبہ حویلی میں جنریٹر کی سہولت بھی مہیا تھی۔ مہرا فیملی کے پرانے ملازم اور ملازمائیں بھی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے حویلی میں موجود تھے اور خدمت کے لیے کمربستہ نظر آتے تھے۔

نور کے تایا ابا خلیل مہرا نے پرانے ملازم فدا حسین سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے اس دفعہ چودھری طغرل سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

فدا حسین بولا ''شاید آپ کو پتا نہیں چلا، پچھلی جمعرات چودھری صاحب کی والدہ فوت ہو گئی ہے۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے ایک ساتھ کہا۔ پھر خلیل مہرا ذرا برہمی سے بولے۔ ''فدا حسین! تم لوگوں کو کسی طرح اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔''

''جی میں نے اپنے پتر کو پھالیہ بھیجا تھا تاکہ آپ کو فون کر سکے مگر آپ کا فون ملا ہی نہیں۔ وہ خود لاہور جا کر آپ کو بتا دیتا پر ہڑتال تھی۔ پہیا جام تھا...... صبح چار بجے وہ فوت ہوئی۔ پیشی (ظہر) کے بعد جنازہ بھی ہو گیا۔''

''اوہو۔ ہمیں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔'' نور کے ابا اشفاق مہرا نے کہا اور تھکاوٹ کے باوجود دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

...... کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ٹویوٹا کار پر سوار تین

کلومیٹر دور گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ سیدھے چودھری طغرل کی حویلی میں پہنچے۔ میلے کے دنوں میں چودھری طغرل کی حویلی میں مسلسل چراغاں کیا جاتا تھا مگر اس بار صورت حال مختلف تھی۔

چودھری طغرل کے ملازموں نے خلیل مہرا اور مولوی اشفاق مہرا کو حویلی کی وسیع بیٹھک میں بٹھا دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چودھری طغرل اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے...... کھڑکھڑاتے ہوئے بادامی رنگ کے شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر اسی رنگ کی طرے دار پگڑی تھی۔

خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے گلے مل کر افسوس کا اظہار کیا اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خلیل مہرا بولے۔ ''اس بات کا بھی بہت افسوس ہے کہ ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکی، ورنہ ہر صورت جنازے میں شریک ہوتے۔''

اشفاق مہرا نے کہا۔ ''آپ ہی ہمیں اطلاع کر دیتے۔ چھ سات گھنٹے کا راستہ تھا، ہم پہنچ ہی جاتے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اطلاع ملی ہے۔ ابھی ہم نے ماں جی کو نہیں بتایا۔ ان کو بھی بڑا دکھ ہونا ہے۔ وہ تو یہاں آتی ہی وڈی اماں جی سے ملنے کے لیے تھیں۔''

''چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو دعا ہی کی جا سکتی ہے۔'' چودھری طغرل نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

مولوی اشفاق مہرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چودھری طغرل اور خلیل مہرا نے بھی اٹھا لیے۔ دعا کے بعد خلیل مہرا نے چودھری طغرل سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ''ابدال اور وارث کہاں ہیں؟''

''کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈیرے پر گئے ہیں۔'' چودھری نے مختصر جواب دیا۔

مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ وڈی اماں کی بخشش کرے اور ان کے درجے بلند کرے۔ ہماری والدہ سے ان کی دوستی بڑی گہری تھی اور کئی طرح کی اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود یہ برقرار رہی۔''

چودھری طغرل نے لمبی سانس لی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، وڈی اماں نے کئی دکھ بھی سہے پر یہ دوستی نبھاتی رہیں۔ کافی احسان ہیں ان کے تم لوگوں پر۔''

چودھری طغرل کے آخری الفاظ نے دونوں بھائیوں کو چونکایا پھر خلیل مہرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک...... بے شک وہ بڑی مہربان عورت تھیں۔ سب کے لیے مہربان تھیں۔''

چودھری اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کچھ احسانوں کا تو لوگوں کو پتا ہے اور کچھ کا پتا بھی نہیں۔ بہرحال اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔''

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے کھنکھارنے اور بولنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے پہچان لیا۔ یہ چودھری طغرل کے بڑے بیٹے ابدال ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید کسی ملازم سے بات کر رہا تھا اور طغرل نے کہا تھا کہ ابدال اور وارث گھر میں نہیں ہیں۔

شاید ابدال وغیرہ ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری طغرل کا رویہ بھی واضح طور پر بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس میں والدہ کی موت کا دکھ بھی شامل تھا۔ یا پھر یہ بات کہ وہ لوگ آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

حویلی واپس آ کر خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے اپنی بیمار والدہ کو ان کی پرانی سہیلی وڈی اماں کی رحلت کی خبر سنائی۔ وہ کافی دیر گم صم رہیں پھر اپنی اوڑھنی سے نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ خود ان کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''ماں جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سفر کی تھکاوٹ بھی ہے۔ کل یا پرسوں کسی وقت چلے جائیں گے۔''

دو دن بعد وڈی اماں کا دسواں تھا۔ دسویں تک تو میلے کی تیاری کچھ سست رہی مگر پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور اکثر اوقات سوگ کی کیفیت میں بھی لوگ خوشی کے مواقع مکمل طور پر ضائع نہیں ہونے دیتے اور پھر وڈی اماں تو ویسے بھی پچانوے سال سے اوپر کی ہو کر گزری تھی۔ اس کے جنازے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجابی میں اسے وڈا کرنا کہتے ہیں۔ بعض برادریوں میں تو ایسے موقعوں پر باجے تک بجائے جاتے ہیں اور خیر خیرات کے علاوہ شیرینی وغیرہ بھی بانٹی جاتی ہے۔ خیر یہاں باجے تو نہیں بجائے گئے تھے مگر میٹھے چاول کی دیگیں پکی تھیں اور کچھ دیگر رسومات بھی ادا ہوئی تھیں۔

دسویں کے بعد اماں والے کا میلا پورے جوبن پر آ گیا۔ وہ ساری مصروفیات اور تفریحات شروع ہو گئیں جو اس میلے کا خاصہ تھیں۔ بارشی نالے کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی منڈی لگ گئی۔ میلے کی دکانیں سجنے سنورنے لگیں۔ سرکس اور تھیٹر کی رونقوں میں اضافہ ہو گیا۔ جھولوں کی گردش بڑھ گئی...... اور پھر وہ دن آیا جب قدیم رسم کے مطابق علاقے کے لوگ اپنے اپنے ہتھیار رضاکارانہ طور پر مزار کے سامنے جمع کرا دیتے تھے...... اور سات دن کے لیے قرب و جوار

میں مکمل امن و امان کی فضا قائم ہوجاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھتے تھے۔ مہرا گھرانے کی عورتیں بھی یہ رسم دیکھنے کے لیے، تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اپنی پرانی حویلی سے گاؤں میں آ گئی تھیں۔ وہ اپنے فروخت شدہ گھر کی چھت پر موجود تھیں اور مزار کے سامنے اہلِ دیہہ کی طویل قطار دیکھ رہی تھیں۔ جہازی سائز کی سات بڑی بڑی چارپائیاں تھیں جن پر ہر طرح کا لائسنسی اسلحہ ڈھیر کیا جارہا تھا۔ باوردی پولیس اہلکار موجود تھے اور اسلحہ جمع کرانے والوں کو رسید نما کوپن دے رہے تھے۔ اسلحے سے بھی کوپن منسلک کیے جارہے تھے۔

قطار میں سے ایک شخص آگے بڑھتا، اپنا ہتھیار جمع کراتا، کوپن حاصل کرتا اور پھر مزار کی طرف رخ کر کے ادب سے سلام کرتا۔ اس کے بعد الٹے قدموں پیچھے پلٹ جاتا۔ اس عمل کے مکمل ہونے تک قریباً ساتوں چارپائیاں مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے آتشیں اسلحے سے لدگئیں۔

دوسرا مرحلہ رات کو تھا۔ اس میں ناجائز اسلحہ بھی اس قدیم کوٹھڑی میں جمع ہوجاتا تھا جہاں ناٹک چندی اینٹوں کی دیواروں میں بے شمار خانے بنے ہوئے تھے اور تالے لگے ہوئے تھے۔

یہ رسم اور اس طرح کی ساری رسمیں اہلِ علاقہ کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ مثلاً آج ہی کے روز شام کے بعد گھروں میں ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی رسم بھی ادا ہوتا تھی۔ یہ ترنجن سے ملتی جلتی تقریب تھی۔ انگیٹھیاں دہکائی جاتی تھیں، گڑ اور باداموں والا حلوا بنایا جاتا تھا۔ علامتی طور پر ایک آدھ رنگین چرخا بھی پاس رکھ لیا جاتا تھا اور سہاگنیں اور کنواریاں ملن اور جدائی کے گیت گاتی تھیں۔

بتول نے کہا۔ ''نورا! آج رات تو یہیں رہیں گے۔ مزہ آئے گا۔''

نور بولی۔ ''آپی...... آپ کو پتا بھی ہے، مجھے یہ ڈھولک شولک اچھی نہیں لگتی۔''

چھوٹی امی زلفت نے کہا۔ ''تو مت ڈھولک بجانا تم۔ سن تو سکتی ہونا۔''

''نہیں چھوٹی امی! میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابا جان کے ساتھ حویلی چلی جاؤں گی۔ صبح پھر آجاؤں گی۔''

ایک عورت نے بسمہ سے مخاطب ہو کر ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ ''بسمہ! تمہاری یہ بہن شروع سے ہی وکھرے ٹائپ کی ہے۔ اس کو تو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ایک ہی

لوڈ شیڈنگ

ایک انگریز نے پاکستان آکر اردو سیکھی۔ جب واپس گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بولنا سیکھا تو اس نے کہا۔ ''لائٹ چلی گئی ہے۔ لائٹ آ گئی ہے۔ لائٹ جانے والی ہے۔ لائٹ آنے والی ہے۔ لائٹ نہیں آئی۔ لائٹ نہیں گئی۔ لائٹ جا بھی سکتی ہے۔ لائٹ آ بھی سکتی ہے۔ لائٹ ڈم آ رہی ہے۔ لائٹ تیز آ رہی ہے۔ لائٹ آ کیوں نہیں رہی۔ لائٹ جا کیوں نہیں رہی۔ لائٹ ابھی تو آئی تھی لو پھر چلی گئی۔''

مرسلہ: کاشف قیوم، کراچی

طریقہ ہے۔ جس طرح مردوں کی کبڈی ہوتی ہے، اسی طرح ہم عورتوں کی بھی کبڈی رکھ لیں۔''

سب ہنسنے لگیں...... نور کا چہرہ سرخ ہوگیا مگر اپنی ماں کی عمر کی عورت کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی...... اور بات صرف اس ایک عورت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر عورتیں اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھتی تھیں۔ خاص طور سے بڑی عمر کی عورتوں کی نگاہوں میں تو اس کے لیے واضح بیگانگی اور تلخی نظر آتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے کسی طور پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک لڑکی مردوں کی طرح بھاگ دوڑ کرے اور مقابلوں میں حصہ لے...... اور لڑکی بھی کوئی عام نہیں، مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی...... گھر کے وسیع صحن میں موجودہ مالک مکان حاجی اکرام صاحب کے بچے جھنڈیاں وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ وہ برآمدے میں سے گزری۔ ایک کمرے سے ابا جان کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے میں اکرام صاحب کے اہلِ خانہ موجود تھے اور وہ ان میں بیٹھے بسمہ کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کامیابی کا ذکر ہو رہا تھا جو بسمہ کو چند دن پہلے تقریری مقابلوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ابا جان کے لب و لہجے میں ایک سرشاری سی بھر جاتی تھی۔

نور ایک طویل سانس لیتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی اور اسے عبور کر کے ڈیوڑھی کی طرف آ گئی۔ یہ سب وہی در و دیوار تھے جن میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ چپے چپے پر

یادیں نقش تھیں مگر اب یہ سب کچھ کسی اور کی ملکیت تھا۔ مہرا فیملی کی حیثیت یہاں ایک دو دن کے مہمان جیسی تھی۔ اس نے اسکارف درست کیا۔ اوڑھنی اچھی طرح لپیٹی اور باہر آ گئی۔ سامنے ہی پرالی کے ڈھیر لگے تھے اور کالی سیاہ بھینسیں کھرلی میں منہ مار رہی تھیں۔ تایا زاد عثمان گاڑی کے پاس کھڑا بچپن کے کسی ہم جولی سے گپ شپ کر رہا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ چونکا اور پاس آ گیا۔ ''کیا بات ہے نور؟''

''عثمان بھائی! طبیعت ذرا بوجھل سی ہو رہی ہے۔ پلیز مجھے حویلی چھوڑ آئیں۔''

''لیکن آج تو یہاں ڈھولک کا پروگرام تھا۔''

''نہیں بھائی۔ یہ نہ ہو بیمار پڑ جاؤں۔ آرام کر لوں گی تو کل تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''کسی دوا وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟'' عثمان نے اپنائیت سے پوچھا۔ نور نے نفی میں جواب دیا۔

وہ عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور حویلی چل دی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ میلے کی رونق کے درمیان سے ہو کر گزرے۔ شامیانوں اور عارضی دکانوں کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ جگہ جگہ پنجابی میوزک بھی پلے ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ہلا گلا کر رہی تھیں۔ یکا یک وہ چونکی۔ اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ ہاں، یہ وہی تھا...... یہ وہی تھا۔ اس کے سر پر شاید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کالی گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ گاڑی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کے لیے ان دونوں کی نگاہیں بھی ملی تھیں۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی اور اس کی شکل اوجھل ہو گئی۔ شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ذوالقرنین ہی تھا۔ اس کی ایک جھلک کل شام بھی اس نے حاجی اکرام صاحب کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ مین دروازے پر کھڑا ابا جان اور تایا جان سے علیک سلیک کر رہا تھا۔ تب نور کی طرف اس کی پشت تھی۔ نور کو بس شک سا ہوا تھا کہ یہ ذوالقرنین ہے لیکن آج تو اس نے اسے صاف دیکھا تھا۔

عثمان پوری توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ نور کسی کو دیکھ کر بری طرح چونکی ہے۔ نور کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کیا عام لوگوں کی طرح صرف میلا دیکھنے آیا تھا؟ یا پھر عام لوگوں کی طرح نہیں آیا تھا؟

حویلی کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر عثمان نے نور کو ڈراپ کر دیا۔ وہ بولی۔ ''عثمان بھائی! تائی امی کو بتا دینا کہ میں یہاں آ گئی ہوں۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

ایک کمرے سے دادی اماں کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی وقت تکلیف میں ہوتی تھیں اور کسی وقت نہیں بھی ہوتی تھیں مگر عادتاً ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی پھپھو حاجرہ اور ایک ملازمہ ان کے پاس موجود تھیں اور ان کی مٹھی چاپی کر رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نور بستر پر گر گئی اور ذوالقرنین کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا وہ اکیلا تھا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا؟ یوں تو شرجیل اور عثمان کے کچھ دوست بھی لاہور سے میلا دیکھنے کے لیے آئے تھے اور ویسے بھی لاہور سے لوگ یہاں پہنچتے تھے مگر ذوالقرنین کا یہاں نظر آنا نور کے لیے اہم اور پریشان کن تھا۔ اس کے ماتھے پر کوئی چوٹ وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پھپھو یا شرجیل سے اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ خیالوں میں الجھی ہوئی وہ سو گئی۔

یوں تو لاہور میں اچھی سے اچھی چوڑیاں اور مہندی وغیرہ مل جاتی تھی مگر یہ بھی میلے کا ''کریز'' تھا کہ دوسرے دن شام کے وقت عورتیں میلے سے چوڑیاں، مہندی اور خوشبو وغیرہ خریدتی تھیں۔ مہرین اور دو ماموں زاد بہنیں نور کو بھی کھینچ کر اس شاپنگ کے لیے لے گئیں۔

نور نے ابھی تک مہرین کو بھی کل والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی مہرین نے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ یہاں ذوالقرنین کی موجودگی سے آگاہ ہے۔ لڑکیاں ایک ریڑھی والے کے پاس کھڑی گول گپے کھا رہی تھیں جب اچانک مہرین نے اس کے بازو پر چٹکی لی اور سرگوشی میں بولی۔ ''وہ دائیں طرف دیکھو ..... کراکری کی دکان کے پاس۔''

نور نے اس رخ پر دیکھا اور اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ وہاں لوگوں کے درمیان ذوالقرنین کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول شلوار قمیص میں تھا اور ایک موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خدیجہ کا بھائی ہے نا یہ؟'' مہرین نے تیز سرگوشی کی۔

نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ذات شریف یہاں کیسے؟'' مہرین بولی۔

ذوالقرنین کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے شاید اپنی چوٹ چھپانے کے لیے اور گرد و غبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبی دار رومال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جس موٹر سائیکل کو

گلکس مار رہا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کی تھی جو پاس ہی کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی۔ عمر رسیدہ شخص خوش ہوگیا...... اور ذوالقرنین کے لیے غالباً شکریے کے الفاظ استعمال کیے۔

موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔ ذوالقرنین کے دونوں ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ موٹر سائیکل کے پلگ وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے اس نے ارد گرد دیکھا اور پھر گول گپے والی ریڑھی کی طرف بڑھا، جہاں بالٹی میں پانی نظر آ رہا تھا اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ نور وغیرہ پر پڑی۔ درمیانی فاصلہ بیس پچیس قدم کے قریب تھا۔ پھر بھی ذوالقرنین نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ریڑھی کی طرف آتے آتے ذرا ٹھٹکا اور پھر رخ پھیر کر ایک شامیانے کی طرف بڑھ گیا جہاں چائے خانے کے باہر نلکا نظر آ رہا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ہاتھ دھوئے۔ اس عمل کے دوران میں اس نے ایک دوبار اچٹتی نظروں سے نور اور مہرین کی طرف بھی دیکھا۔

مہرین نے کہا۔ ''یہ اصلاح معاشرہ یہاں بھی موجود ہے۔''

''ہاں۔ مجھے بھی کل شک ہوا تھا حویلی جاتے ہوئے۔'' نور نے پوری وضاحت نہیں کی۔

''بھئی! امتالے کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی ہے۔ پر پتا نہیں یہ امتالے کی کشش ہے بھی یا نہیں۔'' مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ اب ہاتھ دھو کر سیدھا کھڑا ہوگیا تھا اور قدرے دراز قد ہونے کی وجہ سے ہجوم میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ شانے کشادہ اور سر اور ڈاڑھی کے بال ہموار تھے۔ چائے خانے والے لڑکے نے اسے ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک تولیا رومال دے دیا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ہاتھ پونچھنے لگا۔ نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں لیکن تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نور اور مہرین کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہے۔

نور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گول گپا واپس تھالی میں رکھ دیا تھا۔ چہرے پر اسکارف درست کرتے ہوئے اس نے مہرین سے سرگوشی کی۔ ''چلو چلیں۔''

''بھئی! یہ دو تین گول گپے مجھے بددعائیں دیں گے۔ انہیں تو نگل لو۔'' اس نے پورا گول گپا منہ میں ڈالنے سے پہلے کہا۔

نور تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ اسی دوران میں کہیں پاس ہی موجود سرکس کا شیر اپنے پنجرے میں دھاڑنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی دھاڑ دیکھنے اور سننے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف بھاگے۔ نور نے دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور ذوالقرنین کو بھی کھینچتا ہوا سرکس کی طرف لے گیا۔ ذوالقرنین جیسے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے دو تین بار مڑ کر نور اور مہرین کی جانب دیکھا، پھر اسے ہجوم نے چھپا لیا۔

گول گپے کھانے کے بعد گروپ کی چند لڑکیاں بھی شیروں کو دیکھنے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف چلی گئیں مگر نور دیگر لڑکیوں کے ساتھ میلے کے دوسرے حصے کی طرف روانہ ہوگئی، وہ اپ سیٹ تھی۔

☆☆☆

رات کو مہرین اور نور اپنے اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی مگر جنریٹر کا انتظام موجود تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ دھند...... جامن، مالٹے اور بیری کے ٹنڈ منڈ درختوں کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

مہرین نے کہا۔ ''میں نے پھپو حاجرہ سے تھوڑی سی سن گن لی ہے۔ انہیں بھی پتا نہیں کہ خدیجہ کا بھائی یہاں آیا ہوا ہے۔ ہاں یہ کہہ رہی تھیں کہ لاہور سے اردو بازار کے تین چار دکاندار بھی میلاد دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟'' نور نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ خاص تمہارے لیے نہ آیا ہو۔''

''نہیں مہرین۔'' نور نے اپنی سبز جرسی کی آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو خود کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے۔''

''کیا تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا کہ پرسوں وہ ابا جان اور چچا جان سے بات کر رہا تھا؟''

''ہاں بھئی۔ یہی تھا لیکن تب مجھے صرف شک ہوا تھا۔ اگلے روز تصدیق ہوئی۔''

دونوں خاموش ہوگئیں۔ باہر تاریکی میں کہیں کوئی رات کا پرندہ چہکارا۔ نور کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ اسے کچھ تنبیہ نہیں دے سکتی تھی، پھر اس کی آنکھوں میں سوال کیوں تھے؟ وہ کیوں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا برا انسان نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہو لیکن نور کے ذہن میں جیون ساتھی کا جو تصور تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھا۔

خاموشی کے وقفے کے بعد وہ دونوں پھر باتیں کرنے

لگیں۔ اس مرتبہ موضوع ابا جان کی ناراضگی تھی، جن کو لڑکیوں کا ڈھولک بجانا اور حاجی اکرام صاحب کے گھر رہنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں دادی جان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دی پھر انہوں نے لاٹھی سے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''او لڑکیو! کیا چوں چوں لگا رکھی ہے، آدھی رات ہونے والی ہے، سو جاؤ اب۔''

''اچھا دادی۔'' مہرین نے ناگواری سے کہا اور لحاف میں منہ گھسالیا۔'' دس بجے کو آدھی رات کہہ رہی ہیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

دادی نے کمرے میں جھانکا۔ دروازے کے پاس ہی نور کے جوگر پڑے تھے۔ انہوں نے لاٹھی سے ہی انہیں ایک طرف ہٹایا۔ جیسے وہ جوگر نہ ہوں، کوئی پلید بدبودار شے ہو۔ نور پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور بگڑ کر بولیں۔ ''کہا بھی ہے کہ جلدی سو جایا کرو۔ بند کرو لائٹ۔''

''ابھی کر دیتی ہوں۔ واش روم میں جانا ہے۔'' نور نے کہا۔

''بات ماننی ساری زندگی نہیں آئے گی تجھے۔ بات ماننے والی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ ساری کی ساری ماں پر ہے۔'' ان کی آواز میں زخمی کرنے والی کاٹ تھی۔ وہ باہر نکل گئیں۔

نور کا دل چاہا کہ وہ چلا کر دادی سے کہے کہ اب تو وہ عرصے سے منوں مٹی کے نیچے سوئی ہوئی ہیں...... وہ اب تو انہیں معاف کر دیں مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور ایک نہایت طویل، نہایت تلخ سا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بے طرح جلنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکھ آمیز جھلاہٹ کے ساتھ اٹھی اور لائٹ آف کرنے کے بعد مہرین کی طرح لحاف میں منہ گھسالیا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم ابر آلود تھا۔ رات کو تھوڑے سے چھینٹے بھی پڑے تھے۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خواتین نے حلوا پوری، چنوں اور دودھ پتی کا ناشتا کیا۔ نور چکنائی والی خوراک سے ذرا دور ہی رہتی تھی۔ اس نے دو تین سلائس، انڈے اور اورنج جوس سے کام چلایا۔

ابا جان، تایا جان اور ماموں مراد صبح سویرے ہی گاڑی پر کہیں نکل گئے تھے۔ نور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہیں۔ چودھری طغرل کے گھرانے کی عورتیں بھی کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ کل چوڑیوں کی خریداری کے موقع پر ابدال کی دو بہنیں نظر آئی تھیں مگر انہوں نے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ نور اور مہرین نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید طغرل گھرانے کے ساتھ کوئی تلخ ترش بات ہوئی ہے۔ تائی امی، چھوٹی امی زلفت اور پھوپھو حاجرہ وغیرہ کا بھی یہی خیال تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد مہرین اس کے سر پر سوار ہو گئی۔

''چلو بھئی چلیں۔ اس مرتبہ بڑا زبردست آسمانی جھولا آیا ہے۔ مزہ آجائے گا۔ دور دور تک سارا علاقہ نظر آئے گا۔''

''مہرین! آج نہیں۔ طبیعت بالکل بھی نہیں چاہ رہی۔''

''یار چھوڑو۔ دادی جان کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔ تمہیں تو پتا ہے وہ جیسی ہیں۔''

وہ چپ رہی۔ وہ اسے کیا بتاتی، بات صرف دادی جان ہی کی نہیں تھی، یہاں کون تھا جو اسے اپنایت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت جیسے بے مہر اجنبیوں کے حصار میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ ان گنت سوالیہ نگاہوں کی چبھن اپنے جسم پر محسوس کرتی تھی...... دیکھو اس لڑکی کو...... یہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی ہے۔ یہ بتول اور بسمہ کی بہن ہے۔ یہ اپنے بڑوں کی نافرمان ہے۔ اسے باپ نے دھتکارا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا کام کرتی ہے جو عورتوں کے لیے باعثِ ننگ ہے۔

مہرین نے اپنی انگلی سے نور کے پہلو میں کچوکا دیا۔

''کیا مایوس صورت بنائی ہوئی ہے۔ بھئی، ہم کسی جہلم میں نہیں، میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد اس میلے سے دور ہوں گے اور ہر طرح کے جھمیلے سے قریب ہوں گے۔ چلو اٹھو، میں آج تمہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔''

چھوٹی امی بھی آگئیں۔ وہ پہلی مرتبہ اس میلے میں آئی تھیں اور بہت انجوائے کر رہی تھیں۔ اس میلے کی انوکھی رسموں ریتوں نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

چھوٹی امی اور مہرین کے زور دینے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ براؤن شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہری براؤن جرسی پہنی اور لمبی شال کے ساتھ اسکارف پہن کر تیار ہو گئی۔ میلے کی گہما گہمی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بارش کے اندیشے کے پیش نظر خیمہ زن لوگوں نے اپنے خیموں پر بڑے بڑے پلاسٹک منڈھ دیے تھے اور دیگر احتیاطی تدابیر کی تھیں۔ کسی قریبی میدان میں آج کشتیوں کے مقابلے بھی ہو رہے تھے تاہم وہ ایونٹ شام کا تھا۔ ابھی تو لوگ دیگر تفریحات سے لطف لے رہے تھے۔ آپی بتول بسمہ اور ممانیوں سمیت مہرا فیملی کی اکثر عورتیں برقعوں میں تھیں۔ جو نہیں تھیں، انہوں نے بھی چہرے حجاب یا نقاب

میں چھپا رکھے تھے۔
اچانک نور نے محسوس کیا کہ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں...... ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر آئے...... یا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر نہ آئے؟ نہیں نہیں، وہ اسے دیکھنے کے لیے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیوں دیکھنا چاہے گی؟ وہ شاید لاشعوری طور پر چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو۔ اس کا اردگرد نظر نہ آنا ہی نور کے لیے اچھا تھا۔ ہاں اسی لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔
سب لڑکیاں آسمانی جھولے پر بیٹھیں اور دو تین بار بیٹھیں، جب بلند و بالا جھولا اوپر جاتا تھا تو اردگرد کا علاقہ دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پورا موراں والی گاؤں، اس کی گلیاں، اس کے پیچ و خم اور پھر آگے مویشی منڈی، خریداروں کا ہجوم، بائیں طرف ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر بارشی نالے کا مٹیالا پانی اور اس پانی کے کنارے پرکھوں کی پرانی حویلی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ حویلی کے باہر کھڑی ان کی دو گاڑیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس نالے کے پار آگے تک درختوں، جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے سلسلے تھے اور اس کی دوسری جانب پولیس چوکی کی چھت خاکستری دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھی...... اس چھت پر شاید پولیس والوں کی وردیاں سوکھ رہی تھیں۔ دائیں کنارے پر ایک چٹیل میدان تھا جہاں سیم تھور کی سفیدی تھی۔ اس میدان کی ایک جانب موراں والی گاؤں کے کھیت شروع ہو جاتے تھے، جن میں سے کچھ پر ٹریکٹر چلائے گئے تھے اور کچھ پر کھاد، مکئی اور سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں تھیں۔ دور ایک ڈیرے پر ٹیوب ویل کے پانی کی موٹی دھار چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے اردگرد بچے دوڑتے تھے اور چند عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔
جھولا ابھی رکا ہوا تھا۔ اس کی ڈولی بلندی پر تھی۔ مہرین نے کہا۔ ''اوپر سے چیزوں کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔''
''ہوں۔'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔
مہرین بولی۔ ''آج تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔''
''اللہ کرے نہ ہی آئے۔''
''سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ مسکرائی۔
''جب اس طرح بات کرتی ہو تو زہر لگتی ہو۔'' وہ چڑ کر بولی۔
وہ دونوں اس ڈولی میں اکیلی تھیں۔ اچانک نور کی نگاہ دور نیچے ایک منظر پر پڑی۔ اس نے چودھری طغرل کے چوڑے چکلے بیٹے ابدال کو دیکھا۔ وہ چمکیلے شلوار کرتے اور واسکٹ میں تھا۔ کندھوں پر چودھریوں کے انداز میں تہ شدہ گرم شال ڈال رکھی تھی۔ (یہ وہی تھا جس کے لیے پہلے آپی بتول اور پھر بسمہ کا رشتہ مانگا گیا تھا) ابدال کے پاس ہی ابا جان کا پرانا ملازم خدا بخش تھا۔ کافی فاصلہ تھا، پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ ابدال بڑے سخت لہجے میں خدا بخش سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کسی طرح کی تلخ کلامی تھی، پھر دو تین بندے آگے آئے اور انہوں نے صلح صفائی کا کردار ادا کیا۔
''یہ کیا چکر ہے؟'' مہرین الجھن سے بولی۔
''لگتا ہے کہ دو تین دن سے کچھ گڑبڑ ہے۔ کل ماموں مراد بھی بڑے غصے میں نظر آ رہے تھے۔''
''کہیں وہ پرانا معاملہ ہی تو پھر اٹھ کھڑا نہیں ہوا۔'' مہرین نے ذرا تشویش سے کہا۔
''یہ تو بڑے ہی بتا سکتے ہیں۔ تم جا کر ابا یا تایا جان سے پوچھنا۔''
اس منظر نے مہرین کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ اس کا تفریحی موڈ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گرم شال کو مضبوطی سے اپنے گداز شانوں پر لپیٹ کر بولی۔ ''پتا نہیں کب چلے گا جھولا؟''
''تمہیں تو بلندی اچھی لگ رہی تھی؟'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ (ویسے وہ بھی پریشان تھی)۔
''وہ تو ٹھیک ہے، مگر سردی بھی بڑی ہے۔''
''بلندی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اردگرد کے منظر اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ بلندی صرف اتنا کرتی ہے کہ ہمیں زیادہ کچھ دکھا دیتی ہے اور تفصیل سے۔''
''اچھا زیادہ فلسفہ نہ بگھارو۔ دعا کرو کہ یہ آسمانی چرخا چل پڑے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔'' مہرین نے اپنے مرمریں ہاتھ اوورکوٹ کی جیبوں میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔
اسی دوران میں جنریٹر کی آواز بلند ہوئی اور جھولا حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور مینہ تواتر سے برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ جنریٹر کل سے کام نہیں کر رہا تھا۔ حویلی میں لالٹین اور گیس لیمپس روشن کر دیے گئے۔ حویلی سے تقریباً تین کلومیٹر دور موراں والی میں بھی یقیناً میلے کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ حویلی سے باہر چاروں طرف وہی خاموشی اور یکسانیت تھی جو

متواتر برستی بارش ہی میں ماحول کا حصہ ہوتی ہے۔ سردیوں کی طویل رات سر پر تھی اور صبح بہت دور تھی۔

نور، مہرین، بسمہ اور بتول ایک ہی کمرے میں بیٹھی انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ رشتے میں ان کے ایک چچا تھے جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملتان میں رہتے تھے۔ ملتان سے میلاد دیکھنے یہاں پہنچے تھے اور اچھی کوالٹی کا ملتانی سوہن حلوا بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سوہن حلوا سامنے پڑا تھا مگر لڑکیوں نے بس چکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی نے ماحول کو غنودہ سا کر رکھا تھا۔ کچن میں ملازمائیں کھانا تیار کر رہی تھیں اور پلاؤ اور پالک گوشت کی خوشبو اونچی چھتوں والے کمروں میں چکرا رہی تھی۔

نور نے چھوٹے شیشوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے سے آگے حویلی کے چوبی گیٹ کے پاس دوپہریدار حسب معمول ایک شیڈ کے نیچے لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ ان کے ہتھیار تو میلے کے آغاز میں ہی جمع ہو چکے تھے، اب وہ بس لاٹھیوں سے مسلح تھے۔

نور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابا جان اور تایا ابا ابھی تک نہیں آئے۔ اللہ خیر کرے۔''

''بارش کی وجہ سے رک گئے ہوں گے۔'' بسمہ خود کو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''انہوں نے کون سا پیدل آنا تھا۔'' بتول نے اپنی شیر خوار بچی کو چھاتی سے لگا کر اس پر اپنی گرم شال پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تائی امی نے کچھ نہیں بتایا؟'' نور نے مہرین سے پوچھا۔

''انہیں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی کہہ رہی تھیں، شاید کوئی لین دین کا جھگڑا ہے۔''

''مگر ماموں مراد تو بڑے غصے میں لگ رہے تھے اور وہ چھوٹی موٹی بات پر غصے میں نہیں آتے۔''

اسی دوران میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ''شاید ابا جان آ گئے ہیں۔'' بسمہ بولی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے ابا جان اور تایا ابا ہی تھے۔ دو ملازم چھتریاں تان کر ان کو برآمدے تک لے آئے۔ ان کی شیروانیوں پر بارش کے چھینٹے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے موڈ سخت خراب ہیں۔ لڑکیوں میں سے کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ رات کا کھانا بھی بے دلی سے کھایا گیا۔ خلافِ معمول نور کے ابا جان اور تایا ابا سمیت سب مردوں کا کھانا مردانے میں ہی بھیج دیا گیا۔

نور کافی تھکی ہوئی تھی۔ دادی اماں کی بات کی وجہ سے کل رات اسے بارہ ایک بجے تک نیند نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے مہرین نے جگا کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ جلدی سونا چاہتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوئی اور وہیں آڑی ترچھی پڑی سو گئی۔

وہ کھانسی کی وجہ سے جاگی تھی، وہ خوش خوراک ضرور تھی لیکن پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ کل دوسری لڑکیوں کے ساتھ چند گول گپے کھا کر اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، مہرین اور بسمہ بھی ایک ہی پلنگ پر ڈبل لحاف کے نیچے سوئی پڑی تھیں۔ گیس لیمپ کی روشنی کچھ مدھم ہو گئی تھی اور انگیٹھی تقریباً بجھ چکی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش کبھی آہستہ کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس نے الماری سے کھانسی کا سیرپ نکالا اور ڈیڑھ ڈھکن پیا۔ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اور ہیئر پن اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے نو ہی بجے تھے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ لحاف میں گھسنے سے پہلے وہ دروازے کو بولٹ کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اسے مدھم آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ابا جان، تایا خلیل اور ماموں مراد کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ مردانے حصے میں تھے اس لیے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس گونج سی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

نور میں تجسس تو پہلے سے ہی جاگا ہوا تھا۔ اس نے شال اوڑھی، یخ بستہ چپل پہنی اور باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں، چھوٹی امی زلفت، آپی بتول کی بڑی بیٹی حنا کو اپنے ساتھ لگائے لحاف کے نیچے اونگھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی سو چکے تھے۔ فقط کامن روم میں سے دادی جان کے کھانسنے اور بڑبڑانے کی صدا آ رہی تھی۔

نور دبے پاؤں چلتی نیم روشن راہداریوں سے گزری اور ایک بند دروازے کی چٹخنی بہت آہستہ سے اتار کر مردانے حصے میں آ گئی۔ آوازیں اب واضح سنائی دینے لگی تھیں مگر الفاظ اب بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بڑی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور سننے لگی۔

ابا جان کی سخت آواز ابھری...... ''میں پھر کہتا ہوں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ سویرا ہوتے ہی نکل جائیں۔''

''ایسی بھی لٹ نہیں پڑی ہوئی بھائی جان! ان کی

اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں ہم۔ مگر اندر کی بات کا تو پتا چلے کہ اچانک یہ کایا پلٹ ہوئی کیوں ہے؟'' یہ چھوٹے چچا احسان کی آواز تھی جو ایک ماہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں احسان۔'' تایا خلیل کی پاٹ دار آواز نور کے کانوں تک پہنچی۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ ٹھہرے لہجے میں بولے۔'' سارا معاملہ چودھری طغرل کی ماں کے مرنے کے بعد خراب ہوا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دراصل چودھری طغرل اور اس کا گھرانا اپنی ضد سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں ان لوگوں کی تین نسلوں کو جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت کتے کی اس دم جیسی ہے جو سو سال حقے کی نال میں رہ کر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔''

''تو پھر وہ صلح صفائی کیا تھی۔ ان لوگوں نے تیسری پنچایت میں خود کہا تھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔''

''نہیں احسان! معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوا۔ زہر ان کے اندر پلتا رہا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بتول کا رشتہ مانگا۔ پنچایت کا فیصلہ ہمارے حق میں آیا اور ہم نے فوراً بتول کی شادی کر دی۔ اسی دوران میں ابدال کا چچا سکندر ایم پی اے بن گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی ضد کی باسی کڑی میں ابال لا دیا۔ اسی کے کہنے پر ان لوگوں نے بتول کے بعد بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع کر دیا۔ تم سب کو یاد ہو گا اس مرتبہ پنچایت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان دنوں حالات بڑے خراب ہو گئے تھے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید بسمہ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا۔ بہرحال اللہ نے کرم کیا۔ ایک روز ماں جی (نور کی دادی) خاموشی کے ساتھ اپنی سہیلی وڈی اماں (طغرل کی ماں) کے پاس گئیں۔ کسی زمانے میں یہ دونوں عورتیں دوپٹا بدل بہنیں بھی بنی تھیں۔ دوپٹا بدلی کی یہ رسم اماں والے کے مزار پر ہوئی تھی۔ ماں جی نے اس روز وہی تیس سال پرانا دوپٹا طغرل کی ماں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس دوپٹے کے صدقے اس کی پوتی بسمہ کو معاف کر دے۔ وڈی اماں بھی اپنے زمانے کی مانی ہوئی ہٹ دھرم تھی۔ یہ کچھ دلے ایسے ہوتے ہیں جب بندہ نرم پڑ جاتا ہے۔ پتا نہیں اس دن دونوں عورتوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہوئیں۔ آخر وڈی اماں نے وہ دوپٹا دوبارہ ہماری ماں کے سر پر رکھ دیا...... اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرے گی...... ساتھ ہی اس نے ماں جی سے یہ بھی کہا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو وہ اپنے بیٹوں اور پوتریوں کو لے کر یہاں سے چلی جائے......''

تایا ابا کے اگلے ایک دو جملے نور کی سمجھ میں نہیں آئے کیونکہ بادل زور سے گرجے تھے اور در و دیوار جیسے لرز گئے تھے۔

تب تایا ابا کی آواز دوبارہ نور کے کانوں تک پہنچی...... ''خدا جانے اس عورت نے اپنے بیٹے طغرل اور پوتروں ابدال وغیرہ کو کس طرح ان کے منحوس ارادوں سے باز رکھا اور وہ کس طرح باز آئے۔ بہرحال یہ کام ہو گیا......''

اس موقع پر چھوٹے ماموں مراد نے کچھ کہا۔ چونکہ وہ دور بیٹھے تھے اس لیے الفاظ نور کی سمجھ میں نہیں آئے۔ یہی اندازہ ہوا کہ انہوں نے کھاریوں کی کمینگی کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔

نور کو ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اسے یہاں دروازے سے لگا دیکھ نہ لے۔ اندر ہونے والی گفتگو کے اثرات سے اس کا دل بے طرح دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

اچانک احاطے کی طرف سے ایک بلند آواز نور کی سماعت تک پہنچی۔ پہلے تو وہ اسے چوکیدار کا آوازہ سمجھی لیکن پھر پتا چلا کہ یہ آواز حویلی کے باہر سے آئی ہے۔ بیٹھک کے اندر سے کسی نے کھڑکی کھولی۔ شاید آواز کا ماخذ جاننے کی کوشش کی تھی۔

نور کا پول کھل سکتا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی اور اسی طرح بلی کی چال چلتی ہوئی واپس کوریڈور میں اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اسے یوں لگا، جیسے حویلی کے پھاٹک سے باہر کئی افراد موجود ہیں اور بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی نور پر انکشاف ہوا کہ حویلی سے باہر کافی زیادہ لوگ جمع ہیں اور غالباً ان کی ٹارچوں اور لالٹینوں وغیرہ کی روشنی تھی جو بلند چاردیواری کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

یہ کون لوگ تھے؟

اس وقت اس خراب موسم میں یہاں کیوں آئے تھے؟

کہیں یہ؟......کہیں یہ......؟

وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکی۔ اس نے بے تاب ہوکر دوبارہ کھڑکی کھولی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ یہ دس بیس یا چالیس پچاس لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت زیادہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں اور قہرناک آوازوں میں للکار رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے گہرے بادلوں میں سے چاند نے ایک جھلک دکھائی اور دوبارہ اوجھل ہوگیا۔ ہوا کے یخ بستہ تھپیڑوں نے کمرے کی رہی سہی حرارت بھی ختم کر دی۔

بسمہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دراز ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ویلوٹ کی گلابی قمیص بے ترتیب تھی۔ "کیا ہوا نور؟" اس نے ہراساں آواز میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ شاید کچھ لوگ ہیں باہر۔" نور نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔ اس کا منہ خشک ہونا شروع ہوگیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دیگر خواتین بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نور نے دیکھا، تایا ابا احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ ملازم خدا بخش نے ان پر چھتری کا سایہ کر رکھا تھا۔ ماموں مراد، احسان اور دیگر افراد برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ نور نے ایک بار پھر کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھول دی تاکہ باہر کی آوازیں سنی جاسکیں۔ چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ، تائی راحت اور دیگر خواتین بھی اس ادھ کھلی کھڑکی کے پاس آگئیں۔ لوہے اور لکڑی کے اس مضبوط گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ نور کے تایا ابا نے شاید یہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا مگر اسی دوران میں حویلی کا پرانا ملازم فدا حسین لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ "نہیں مالک!" وہ ہراساں آواز میں بولا۔ "دروازہ نہ کھولیں۔ مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔"

"تو پھر؟" تایا ابا کی آواز نور وغیرہ کے کانوں تک پہنچی۔

فدا حسین آگے بڑھا اور اس نے گیٹ میں ایک جانب موجود وہ چھوٹا سا روزن کھول دیا جس میں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔

تایا ابا اس روزن کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے باہر کسی سے مخاطب ہوکر کہا۔ جواب میں چودھری طغرل کی بلند آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو خلیل! ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں۔"

"بات کرنے کا یہ کون سا وقت اور طریقہ ہے۔" تایا خلیل نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"یہی طریقہ ہے...... یہی طریقہ ہے۔" ایک اور گرجدار آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً طغرل کے بڑے بیٹے ابدال کی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا، کوئی چیز گیٹ سے ٹکرائی اور ملازم فدا حسین نے لپک کر روزن کو بند کر دیا۔ جونہی روزن بند ہوا گیٹ کو دھکیلا جانے لگا اور اس پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ چودھری طغرل کی للکار سنائی دی۔ "دروازہ کھولو خلیل! نہیں تو توڑ دیں گے ہم۔"

اب نور کے ابا جان، ماموں مراد اور تایا زاد بھائی شرجیل اور عثمان وغیرہ بھی بارش کی پروا کیے بغیر احاطے میں نکل آئے تھے۔ رکھوالی کے کتوں نے جیسے شدید خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور مسلسل شور مچا رہے تھے۔ حویلی کی چودہ فٹ بلند باؤنڈری وال کی دوسری جانب بیسیوں افراد کے للکارے سنائی دے رہے تھے۔

نور کے ابا جان نے ماموں مراد کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ "مراد! ٹیلی فون کرو...... پولیس چوکی میں فون کرو۔"

ان کی آواز یقیناً باہر بھی سنی گئی تھی۔ باہر سے چودھری طغرل کی دہاڑ سنائی دی۔

"مولوی مہرا! خیریت چاہتا ہے تو دروازہ کھلوا دے۔ ورنہ آج سارے اگلے پچھلے حساب برابر ہوجائیں گے۔ ابھی اسی وقت۔"

یہی وقت تھا جب نور نے دیکھا کہ ماموں مراد کامن روم کی طرف سے گھبرائے ہوئے نکلے۔ پھپھو حاجرہ نے کھڑکی میں سے پوچھا۔ "کیا ہوا مراد؟"

وہ دانت پیس کر بولے۔ "حرامزادوں نے فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔"

"ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟" پھپھو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ماموں مراد جواب دیے بغیر احاطے کی طرف چلے گئے۔

اسی دوران میں حویلی کی بالائی چھت پر سے چوکیدار گل محمد پکارا۔ "مہرا صاحب! یہ لوگ سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

تب نور اور دیگر عورتوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا...... گیٹ کے دونوں چوکیدار لاٹھیاں سونت کر باؤنڈری وال کی طرف لپکے۔ باؤنڈری وال کے بالائی

سرے پر دو انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی افراد تھے جو اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ چوکیدار نے بے دریغ ان پر لاٹھیاں برسائیں ...... دونوں ہیولے اوجھل ہو گئے۔ اب صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کھلی لڑائی کی شکل بن گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس صورتِ حال میں فائرنگ یا ہوائی فائرنگ بھی شروع ہو جاتی مگر حویلی میں اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا اور شاید باہر والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔

ماموں مراد، شرجیل اور عثمان وغیرہ سرتاپا آتش بن گئے تھے۔ ماموں مراد نے ملازموں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی کی "لوروف" پر چلے گئے۔ یہاں سے وہ کسی بھی ایسے شخص کو روک سکتے تھے جو سامنے سے بیرونی دیوار پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ باہر سے سنائی دینے والا شور وغل بڑھتا جا رہا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں۔ حویلی میں مہرا فیملی کے قریباً پندرہ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ لاہور سے آنے والے سات آٹھ مہمان حویلی کے مہمان خانے میں بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حویلی کے ملازم تھے جن میں ایک مالی، اس کے دو جوان بیٹے، خانساماں اور چوکیدار وغیرہ شامل تھے۔

تین چار منٹ کے اندر اندر سب لوگوں کو صورتِ حال کی شدید سنگینی کا احساس ہو گیا۔ شرجیل کو جب پتا چلا کہ کچھ افراد دو بانسی سیڑھیاں لے کر حویلی کی عقبی دیوار کی طرف گئے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر والی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں پر اینٹیں وغیرہ برسائیں اور انہیں اوپر نہیں چڑھنے دیا۔

عورتوں کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ دادی اماں بھی آ گئی تھیں اور انہیں دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی تھیں۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی تھی، تاہم گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور احاطے کے مناظر روشن ہو جاتے تھے۔ مہرین، نور اور بسمہ زینے چڑھ کر دوسری منزل پر آ گئیں۔ یہاں سے منظر زیادہ وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نور کا دل بیٹھ گیا کہ اس تاریک سنسان رات میں ان کی حویلی سے باہر بپھرے ہوئے دیہاتیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور چمکیلے کوکوں والی لاٹھیاں چمک رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں پرانی طرز کی برچھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلحہ تھانے میں جمع ہو چکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی موجود ہوتا۔ ان لوگوں کی بھڑکوں اور للکاروں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں سے کئی نشے میں ہیں۔ شاید خشت باری سے ان کے کچھ ساتھی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ وہ گندی گالیاں بک رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

نور حوصلہ مند لڑکی تھی، سکہ بند نسوانیت سے اسے زیادہ تعلق نہیں تھا مگر اس موقع پر اس کا دل بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

دوسری منزل سے وہ گفتگو واضح سنائی دینے لگی جو تایا ابا اور چودھری طغرل وغیرہ کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو بڑی بلند آواز میں ہو رہی تھی، وجہ یہی تھی کہ چودھری طغرل گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ چودھری طغرل دہاڑ رہا تھا۔

"اوئے مہرا! دعائیں دو اس عورت کو جس کی وجہ سے اب تک بچے ہوئے تھے تم۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے تو بھی کم تھا۔" (وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا)

نور کے تایا ابا نے کہا۔ "تو پھر اب کیا ہو گیا ہے چودھری؟ اب کیوں کر رہے ہو یہ سب کچھ؟ کیوں طوفان کھڑا کر رہے ہو؟"

"اب وہ نہیں رہی۔ وہ چلی گئی ہے۔ مر گئی ہے، صبر کا گھونٹ پی کر اور اس کے ساتھ ہی وہ بات بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب ہمیں اپنی منگ چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ہم کھاپڑی ہیں اور کھاپڑی اپنی بات دیاہنے کے لیے سو سال تک بھی انتظار کرتے ہیں۔"

"غلط بات نہ کرو چودھری! تم چنگی طرح جانتے ہو، کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک اڑتی اڑتی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنایا اور اب تو وہ بات بھی ختم ہو چکی تھی...... سب کو پتا ہے کہ......"

"نہیں ہوئی تھی بات ختم...... نہیں ہوئی تھی۔" طغرل خلیل مہرا کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ "تم مولویوں کو کیا پتا کہ ہم نے کیا کیا باتیں سنی ہیں لوگوں کی۔ کہاں کہاں ہماری پگ گری ہے اس رشتے کی وجہ سے...... بزدلی، بے غیرتی کے طعنے سنے ہیں ہم نے۔ بس اس ماں کی وجہ سے چپ تھے......"

طغرل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سابق ایم پی اے سکندر بولا۔ "مولوی اشفاق! اب بھی ہم تیری بیٹی کو اٹھانے کے لیے نہیں ویاہنے کے لیے آئے ہیں۔ شرع کے مطابق اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے نوں (بہو) بنانا ہے ہم نے۔ اپنے ان غنڈوں کو باز کر جو اینٹیں چلا رہے ہیں۔ ورنہ پھر فساد ہو گا اور وہ سب کچھ ہو گا جو ہم نہیں چاہتے۔"

زور سے بجلی چمکی اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار دور تک روشن ہو گئے۔ نور کی نگاہوں نے ایک حیران کن منظر کی جھلک دیکھی۔ ایک سفید گھوڑی پر ایک شخص سہرا

باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد چمکیلے کپڑوں والے کچھ لوگ براتیوں کی طرح موجود تھے۔ سہرے والا شخص یقیناً ابدال ہی تھا۔ نور کے سینے میں دل جیسے ٹھہر گیا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا۔ اس نے کن انکھیوں سے بسمہ کی طرف دیکھا، وہ شاید یہ منظر نہیں دیکھ پائی تھی مگر مہرین کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے وہ جھلک دیکھی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جتنی وہ سمجھ رہے ہیں۔

''یا اللہ رحم کر۔'' نور کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اشفاق مہرا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کچھ شرم کرو چودھری۔ کیا یہ طریقہ ہوتا ہے بیٹیوں کو بیاہنے کا۔ تمہاری دھی کی برات اس طرح آئے تو کیا تمہیں قبول ہوگی؟''

''میری دھی کی برات اس طرح نہیں آئے گی مولوی اشفاق، کیونکہ میرے منہ میں زبان ہے...... کسی پلید جانور کا چمڑا نہیں۔ ہم نے کل بھی تمہیں سمجھایا تھا۔ اب یہ کام ہونا ہی ہے، تم چاہو تب بھی، نہ چاہو تب بھی۔ چنگا یہی ہے کہ دروازہ کھول دو اور کڑی کو تیار کرو۔ نکاح خواں ساتھ ہے۔ ابھی سب کچھ ہوگا، ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب دائیں طرف سے پھر کچھ افراد نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لٹھ بردار تیار تھے، وہ لپکے اور اندھا دھند لاٹھیاں برسا کر انہیں نیچے گرا دیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد گھیراؤ کرنے والوں کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے جیسے گیٹ پر ہلا ہی بول دیا تھا۔ انگریزوں کے دور کا یہ قدیم گیٹ کسی قلعے کے دروازے جیسا تھا۔ باؤنڈری وال کی طرح اس کے اوپر بھی نوکدار آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اوپر سے بند تھا اور اسے پھاندا نہیں جا سکتا تھا۔ درجنوں افراد ایک ساتھ مل کر اسے دھکیلنے لگے اور وزنی چیزوں سے ضربیں لگانے لگے۔ یہ دہشت ناک مناظر تھے۔

ماموں مراد بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ وہ نور سمیت تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ چلو نیچے چلو۔ جب تک ہم نہ کہیں کوئی کمرے سے باہر نہ نکلے۔''

وہ انہیں لے کر نیچے آ گئے۔ نیچے بھی کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آپی بتول بے ہوش ہوگئی تھیں۔ چھوٹی امی ان کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''آنکھیں کھولو، بتول! ہوش کرو۔'' پھپھو حاجرہ نے بے تاب ہو کر اسے جھنجوڑا۔

اس کی آنکھیں بند رہیں، تاہم وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔

''اب کیا ہوگا مراد۔'' تائی راحت نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا...... یہ لوگ...... بسمہ کی بات کر رہے ہیں...... بسمہ کے رشتے کی......؟''

''میں دوں گا ان کو رشتہ، بڑی اچھی طرح دوں گا۔'' مراد پھنکارا اور پھر کچن کے اندر سے ایک بڑی چھری نکال لایا۔ ''میں آنتیں نکال دوں گا اس کنجر ابدال کی اور اس کے باپ کی۔ مار ڈالوں گا سب کو۔''

وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو کر احاطے کی طرف بڑھا۔ عورتیں ایک ساتھ چلائیں۔ ان کی پکار سن کر چوکیدار اور دیگر افراد مراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا ہے اور باہر نکلتے ہی ابدال کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ شرجیل بھی اس کے عقب میں تھا۔

تین چار افراد نے مراد سے لپٹ کر اسے روک لیا اور کھینچ کر واپس برآمدے میں لے گئے۔ تایا خلیل نے مراد کو بری طرح ڈانٹا۔ پھر انہوں نے نور کے ابا جان سے کہا۔ ''اشفاق! تم ان لڑکوں کو لے کر اندر چلے جاؤ۔ ہم بات کر رہے ہیں۔ اس طرح کام اور خراب ہو جائے گا۔''

چھت پر سے ہونے والی خشت باری اب رک گئی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ فی الحال باہر سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

نور نے دیکھا، تایا ابا اور مہمان خانے سے نکلنے والے دو بارعب افراد گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ گیٹ کا چھوٹا روزن کھلا ہوا تھا اور کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ بات چیت یقیناً تکرار کی شکل میں تھی لیکن آوازیں بلند نہیں تھیں۔ حویلی کے زیادہ تر مرد اور لڑکے چھت پر تھے۔ اگر باہر موجود مشتعل لوگوں میں سے کوئی باؤنڈری وال کی نوکدار سلاخیں پھلانگنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے روکنے کے لیے تیار تھے۔

چند منٹ بعد تایا جان اور ابا جان ستے ہوئے منہ سے حویلی کے اندرونی حصے میں واپس پہنچ گئے۔ ملازم خدا بخش کے ہاتھ میں ایک گول طشتری تھی۔ تانبے کی اس منقش طشتری میں قریباً ایک درجن دیے پڑے تھے۔ مٹی کے ان دیوں میں سے کچھ الٹے تھے اور کچھ سیدھے۔ خدا بخش نے دل گرفتہ انداز میں یہ طشتری میز پر رکھ دی اور بیزار سا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا ہے تایا ابا؟'' بتول نے سراسیمہ

لہجے میں پوچھا۔

تایا ابا گم صم رہے پھر خدا بخش سے بولے۔ ''تم ہی بتاؤ چاچا۔''

خدا بخش گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اس کو 'نیاں' کی رسم کہتے ہیں جی۔ پرانے وقتوں سے چلی آ رہی ہے۔ کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ نہیں بھی مانتے۔''

''یہ ہے کیا؟'' چھوٹی امی زلفت نے استفسار کیا۔

خدا بخش نے پریشان نظروں سے نور کی دادی اماں اور پھپو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ دادی اماں کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ تانبے کی طشتری اور دیوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

خدا بخش نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ ''رشتے ناتے یا پھر لین دین کے معاملے میں جب کوئی بڑا جھگڑا ہوتا ہے تو حضرت اماں والے کی رائے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھالی میں بارہ دیے رکھے جاتے ہیں اور رکھنے والا یہ کہتا ہے کہ اگر وہ حق پر ہے تو پھر دیے اس پر گواہی دیں۔ یہ دیے مزار کی ایک محراب میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ وہی سرخ محراب ہے جو مزار کی دائیں جانب پتھر کی جالی کے پاس نظر آتی ہے۔''

''محراب میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' انگلینڈ پلٹ احسان نے پوچھا۔

''یہ محراب دراصل ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں ہر وقت ہوا آتی رہتی ہے۔ شام کے بعد چلنے والی ہوا اس میں سے کچھ دیے بجھا دیتی ہے اور کچھ جلتے رہتے ہیں۔ اگر زیادہ دیے جلتے رہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیاں لینے والا حق پر ہے...... یہاں بھی چودھری طغرل نے نیاں لیا ہے اور کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔''

''یہ دیے جو اوندھے پڑے ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟'' بیگم زلفت نے پوچھا۔

''یہ وہ ہیں جو بجھ گئے تھے۔'' خدا بخش نے جواب دیا۔

نور نے اوندھے پڑے دیے گنے، وہ چار تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چار دیے بجھے تھے اور آٹھ جلتے رہے تھے۔ یہ فال ہی کی کوئی قسم تھی۔ اس کے بارے میں اور اس طرح کی کئی رسموں کے بارے میں نور نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔

شرجیل بولا۔ ''یہ تھالی بھی تو یہ خبیث ہی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا کہ کتنے جلے اور کتنے بجھے اور آپ خود ہی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نیاں شیاں کو مانتے ہی نہیں۔''

فدا حسین نے مدھم آواز میں کہا۔ ''نکاح خواں مولوی شمس بھی ساتھ ہیں۔ وہ گواہی دے رہے ہیں کہ نیاں ہوا ہے۔''

''یہ سب کیا بے ہودگی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔'' شرجیل تڑخ کر بولا۔ ''ایک طرف یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امن والے کا میلا ہے اور اپنے ہتھیار جمع کراتے ہیں، لڑائی جھگڑے کو بڑا گناہ سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟''

خدا بخش مری مری آواز میں بولا۔ ''اس لیے تو یہ نیاں وغیرہ کیا ہے ان لوگوں نے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس رسم کے بعد انہیں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔''

مراد نے نفرت سے ایک طرف تھوک دیا۔

شرجیل نے کہا۔ ''پرسوں ایک متولی کہہ رہا تھا، میلے پر کبھی بارش نہیں ہوئی۔ یہ مزار والے کی کرامت ہے اور شام کو جب بارش شروع ہوئی تو وہی متولی اسے رحمت کہہ رہا تھا اور خیال ظاہر کر رہا تھا کہ اس مرتبہ اوپر والے نے زائروں کے گناہ دھونے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''بس یہ وہم اور بے کار عقیدے ایسے ہی لمبی لمبی جڑوں والے ہوتے ہیں۔'' تایا ابا نے کہا۔ ''بے شک یہ ایک اللہ والے کا مزار ہے اور وہ بلند پایہ ہستی تھے مگر ایسی پاک جگہوں پر اپنے کاروبار چمکانے والے لوگ نت نئی حکایتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔''

مراد نے غصے میں طشتری کو ہاتھ مار کر دور ہٹا دیا۔

''میں نہیں مانتا ان فالوں شالوں کو۔ یہ لوگ بس بدمعاشی کر رہے ہیں۔ زور دکھا کر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ ہماری بیٹی کوئی گاجر مولی نہیں جو یہ اکھاڑ کر لے جائیں گے۔ ان کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا۔'' وہ ہمیشہ سے غصے والا تھا اور اس وقت اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

مولوی اشفاق مہرا بھی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے تھوڑی دیر پہلے بڑے بھائی خلیل مہرا نے انہیں بہانے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔

خلیل مہرا نے مراد کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ''یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے، بارش ہو رہی ہے۔ نہ اس طرف کسی نے آنا ہے نہ جانا ہے۔ ہم کو یہ لوگ باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے کچھ سوچنا ہوگا۔''

مراد نے ایک بار پھر طیش بھری نظروں سے تانبے کی طشتری اور اس میں سیدھے اور اوندھے پڑے مٹی کے دیوں کو دیکھا اور بولا۔ ''لیکن میں ان بے کار رسموں کو نہیں مانتا۔ یہ لوگ بس اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ان رسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ رسم نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی...... کوئی اور فال ہوتی۔ ان لوگوں نے ہم پر چڑھائی کرنا ہی تھی۔''

عمر رسیدہ ملازم خدا بخش نے کہا۔ ''بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان رسموں کے بہت سے نقصان ہیں پر کچھ فائدے بھی تو ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر اسلحہ جمع کرانے کا رواج نہ ہوتا اور لوگ اس پر پورا یقین نہ رکھتے تو ......اب تک شاید یہاں بہت نقصان ہو گیا ہوتا......''

''نقصان کیا، دونوں طرف سے کئی لاشیں گر گئی ہوتیں۔'' خلیل مہرا صاحب نے تائید کی۔

یہی وقت تھا جب احاطے کی طرف سے کچھ ٹوٹنے اور گرنے کی آواز آئی۔ رکھوالی کے کتوں نے شور مچایا اور مختلف آوازیں بھی سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد بوڑھا ملازم فدا حسین ہانپا ہوا اندر آیا۔ خلیل مہرا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مالک! انہوں نے رسے ڈال کر ایک طرف سے دیوار کا جنگلا گرا دیا ہے...... لگتا ہے کہ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔''

خلیل مہرا، اشفاق مہرا، مراد اور دیگر افراد احاطے کی طرف لپکے۔ نور، مہرین اور دیگر لڑکیوں نے کھڑکی سے جھانکا، صاف طور پر تو دکھائی نہیں دیا مگر اندازہ ہوا کہ بلند باؤنڈری وال کے بالائی حصے پر لگی نوکدار سلاخوں والی باڑ کا کچھ حصہ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہاں سے باڑ اکھاڑ دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹے آہنی تار کی مدد سے اس باڑ پر کمند ڈالی گئی تھی اور اس کمند کو جھٹکے دے دے کر قریباً پندرہ بیس فٹ چوڑائی کا ایک ٹکڑا نیچے گرا دیا گیا تھا۔ اب اس حصے سے باؤنڈری وال پر چڑھنا آسان ہو گیا تھا۔ بہر حال ابھی یہاں سے چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید یہ کارروائی صرف دباؤ ڈالنے کے لیے کی گئی تھی کہ اگر ان کی بات نہیں مانی گئی تو وہ ہر حد تک جائیں گے۔

گیٹ کے مختصر روزن میں سے ایک بار پھر دو طرفہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ مستطیل روزن چوڑائی میں دو فٹ کے قریب اور اونچائی میں صرف سات آٹھ انچ تھا۔ تانبے کی طشتری بھی اسی خلا سے اندر بھیجی گئی تھی۔

گیٹ پر ہونے والی گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی۔ بارش کی بوچھاڑوں ہی کی طرح کبھی لہجے مدھم اور کبھی تند و تیز ہو جاتے تھے۔ شرجیل اندر آیا تو سب عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ''کیا بات ہوئی شرجیل؟'' تائی راحت نے بیٹے سے پوچھا۔

''بس ہو رہی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

''کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ...... شاید...... کوئی اچھا مشورہ ہی دے دیں۔'' بیگم زلفت نے استفسار کیا۔ خالہ عریفہ نے بھی ساتھ دیا۔ سب کے رنگ زرد تھے۔

''وہ خبیث اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں......'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر بسمہ کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ہلدی ہو رہی تھی۔

خالہ عریفہ بسمہ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شرجیل نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اور اس کے ہمنوا بسمہ کے حوالے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ وہ اسی وقت نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں۔ ابا جان، چچا جان اور دیگر اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم آج رات کے لیے اس معاملے کو ٹال دیا جائے اور کل پنچایت میں اس کا حل نکالا جائے لیکن یہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

باہر سے ایک دم شور بلند ہوا اور مار دھاڑ کی آوازیں آئیں۔ لڑکیاں چلّا اٹھیں۔ شرجیل بھی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں باقاعدہ لڑائی کا منظر تھا، باہر کے لوگوں نے جس جگہ سے باؤنڈری وال کی نوکدار گرل اکھاڑی تھی، اب وہاں سے کچھ افراد اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بجلی چمکی اور چند ساعتوں کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ نور نے دیوار کا منظر دیکھا۔ یہ ایک جنگی منظر جیسا تھا، کم از کم چار پانچ افراد تھے جنہوں نے چوٹ سے بچنے کے لیے سروں پر بھاری پگڑیاں کس رکھی تھیں اور دیوار پھاندنے کی کوشش میں تھے۔ ان پر چھت پر سے اینٹیں برس رہی تھیں اور احاطے میں موجود افراد لمبی لاٹھیوں سے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور اب وہ لوگ ہر صورت اندر گھسنا چاہتے ہیں۔

ان کے للکارے خوفناک تھے۔ وہ گندی گالیاں دے رہے تھے اور اندر موجود عورتوں کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

بسمہ، بتول اور ماموں کی لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ تائی راحت سجدے میں گر گئیں اور جان آبرو کی سلامتی کے لیے گڑگڑانے لگیں۔ دادی اماں کا برا حال تھا اور ان کو سنبھالتے سنبھالتے پھپو حاجرہ خود بھی نیم جان ہو رہی تھیں۔

حویلی کے مردوں نے، جن میں باہمت ملازم بھی شامل تھے، جان پر کھیل کر اندر گھسنے والوں کی کوشش ناکام بنادی۔ اس کوشش میں چار پانچ افراد کو شدید زخم آئے لیکن جس کو شدید ترین چوٹ لگی وہ نور کے ماموں مراد تھے۔ باہر سے جوابی خشت باری بھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ لگنے سے ان کے سر پر گہرا زخم آیا تھا..... اور بالائی ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

انہیں اندر لایا گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ بہرحال نور اور مہرین کسی حد تک حوصلے میں رہیں۔ ایک فزیوتھراپسٹ کی حیثیت سے مہرین میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ حویلی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ مہرین نے سب سے پہلے مراد کے سر سے بہنے والا خون بند کیا اور پھر عارضی بینڈیج کر دی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''فوری خطرے کی تو کوئی بات نہیں..... مگر ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوگی۔''

حویلی کے سامنے ''لوردف'' پر حویلی کے آٹھ دس افراد موجود تھے۔ اگر باؤنڈری وال کے شکستہ حصے سے کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے موثر طریقے سے روکا جاسکتا تھا مگر یہ دفاع کتنی دیر تک چل سکے گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نور نے دیکھا، بسمہ سکڑی سمٹی ہوئی ایک سہمی چڑیا کی طرح کونے میں گھسی ہوئی تھی۔ گاہے بگاہے دہشت زدہ نظروں سے اپنے بڑوں کے چہرے دیکھتی تھی۔ اسی اثنا میں چھوٹی امی زلفت اور پھپو حاجرہ نے اس کے ابا جان کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوئی خاص قسم کی گفت گو کر رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد تینوں باہر آگئے۔ ابا جان کا چہرہ بدستور کرب کی آماجگاہ تھا۔ یہی وقت تھا جب ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا تھا اور اس نے پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ ابا جان کی طرف بڑھایا تھا۔ اس لفافے میں سرخ رنگ کا کوئی کامدار کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ خدا بخش نے نور کے ابا جان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔''

یہ بسمہ کے لیے شادی کا جوڑا بھیجا گیا تھا۔ نور کے ابا جان نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا تھا اور بے دم سے ہو کر بسمہ کے پاس قالین پر بیٹھ گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منظر نور کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا جب اس نے چھوٹی امی زلفت کو سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ ابا جان کے پاس بیٹھے اور انہیں سمجھاتے دیکھا تھا۔ ابا جان جھلا کر بولے تھے۔ ''تو کیا کروں میں؟ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں۔ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے، اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لو۔''

''نہیں جی..... لیکن..... جو کچھ بھی ہو رہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔''

''اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟'' اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''..... جو کچھ بھی ہے، وہ لوگ..... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں..... لیکن..... اگر خدانخواستہ..... یہ لوگ اندر گھس آئے اور..... دو چار موتیں ہو گئیں..... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اسی دوران میں دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ حویلی کی سہمی ہوئی عورتیں بے طرح چلا اٹھی تھیں اور مرد سیڑھیوں کی طرف لپک گئے تھے۔ بعدازاں پتا چلا تھا کہ شرجیل، عثمان اور غیاث وغیرہ نے ملازموں کے ساتھ مل کر حویلی کی خستہ برساتی کی ایک دیوار گرادی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر دوبارہ مارا ماری کی نوبت آئے تو چھت سے خشت باری کرنے کے لیے اینٹیں اور روڑے مہیا ہو سکیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں چھوٹی امی زلفت اور پھپو حاجرہ وغیرہ نے ابا جان اور تایا ابا کو نیم رضامند کر لیا تھا۔ کوئی دوسری راہ سجھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ مراد شدید زخمی تھا اور حالات اتنے سنگین تھے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ حکم حاکم مرگِ مفاجات والی صورتِ حال تھی اور پھر نور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اشک بار چھوٹی امی اور خالہ عریفہ نے، باہر سے بلند ہونے والے پُرغضب للکاروں کی گونج میں پیلا دوپٹا روتی سسکتی بسمہ کے سر پر ڈالا اور اس کے لرزاں ہاتھوں پر مہندی لگانا شروع کی۔

آہ...... یہ کیسی شادی تھی...... یہ کیسا نکاح تھا؟ پنچایتوں، بیٹھکوں اور جرگوں کے حکم پر یہ زنا بالجبر کے کیسے تماشے لگائے جاتے ہیں۔ جاہلیت اور انا پرستی کے حصار میں آبرو ریزی کے یہ کیسے کھیل، کھیلے جاتے ہیں؟

نور نے سوچا اور اس کے سر کی نسیں پھٹنے لگیں۔ وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

ہاں...... اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں...... اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی طویل فلم چلی تھی جو بچپن اور لڑکپن سے شروع ہوئی۔ موراں والی گاؤں کے گلی کوچوں سے ہو کر نکلی اور لاہور پہنچی...... وہاں کی شاہراہوں، درس گاہوں اور کھیل کے میدانوں سے ہوتی ہوئی، سویمنگ کے ہیجان خیز ٹریک تک آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ماضی کی کھڑکی سے یادوں کا کتنا بڑا ہجوم دیکھا تھا...... اور اب ایک بار پھر وہ تصور کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں موجود تھی۔ حقیقت جو دسمبر کی اس خوفناک رات میں بے حد بے رحم اور لرزہ خیز تھی۔ حویلی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ ارد گرد دور تک کوئی مددگار نہیں تھا اور نہ کسی کو خبر تھی کہ اس برسات کی رات میں یہاں بارشی نالے کے کنارے اس تنہا حویلی پر کیا گزر رہی ہے۔ بچاؤ کی بس ایک ہی شکل رہ گئی تھی۔ بسمہ کو سرخ جوڑا پہنایا جاتا اور اسے ان زبردستوں کے حوالے کر دیا جاتا جو باقاعدہ برات کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ وہ اسے لے جاتے۔ بدمست چودھری زادہ آج رات ہی شادی کے نام پر اسے روند ڈالتا۔

ساتھ والے کمرے سے بسمہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ چھوٹی امی، پھوپھا جرہ اور تائی وغیرہ کی سرگوشیاں بھی جو اسے حوصلہ دینے میں مصروف تھیں۔ نور نے وال کلاک کی طرف دیکھا...... آہ، ابھی صرف دو بجے تھے۔ صبح بڑی دور تھی۔ قرب و جوار میں بھیگی ہوئی سنسان رات نے اپنے بے مہر پنجے گاڑ رکھے تھے۔ لق و دق، سنسان اور پھنکاتی ہوئی رات۔

یکایک دوبارہ زبردست شور سنائی دیا۔ نور کے ابا جان، تایا ابا اور ملازمین احاطے کی طرف لپکے۔ نور کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ عورتیں سسکنے لگیں۔ شور حویلی کے دائیں پہلو میں مہمان خانے کی جانب تھا۔ یہ مہمان خانہ (جو پندرہ بیس سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا) حویلی کی بیرونی چار دیواری سے ملا ہوا تھا۔ کھا پریوں کے للکارے، گالیاں، دھاڑیں، ہر آواز ان کی سماعتوں کا عذاب تھی۔ صورتِ حال واضح ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔

☆☆☆

برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ نور نے دیکھا کہ ملازمین نے کسی کا خونچکاں جسم اٹھا رکھا ہے اور اسے مردانے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھ کر کانپ گئی۔ یہ حویلی کے سب سے پرانے ملازم فدا حسین کا بیٹا رشید تھا۔ ہاں نور کی نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں، وہ رشید ہی تھا۔ غالباً اس کے سینے پر کوئی بہت بڑا گھاؤ تھا جس نے اس کے پورے بدن کو لہو رنگ کر رکھا تھا۔ یہ محسوس کر کے نور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ رشید شاید زندہ نہیں ہے۔

خواتین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جا رہا تھا لیکن نور نے اپنے تایا زاد عثمان کو سیڑھیوں کے نیچے گھیر لیا۔ ''آخر کیا چھپا رہے ہو تم؟'' وہ اس کے بازو میں اپنے ناخن گھساتے ہوئے بولی۔

اس نے گول مول بات کرنے کی کوشش کی مگر نور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ آخر وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''ان حرامزادوں نے مار ڈالا ہے اس کو...... جان لے لی ہے اس کی۔''

نور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی پھر ہمت کر کے بولی۔ ''مگر ہوا کیا ہے؟''

جواب میں تایا زاد عثمان نے دلدوز لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...... مہمان خانے کے عقبی کمرے باؤنڈری وال سے ملے ہوئے تھے۔ فدا حسین کے بیٹے رشید نے یہاں سے نکلنے اور پولیس چوکی تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ وہ دلیری کے ساتھ مہمان خانے کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے باہر چھلانگ لگا کر اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی قسمت اچھی ہوتی تو شاید وہ نکل جاتا مگر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھ لیا گیا۔ وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس کے پاس وہی مراد والی چھری تھی، اس نے چھری چلا کر خود کو چھڑانا چاہا مگر...... بپھرے ہوئے شرابیوں نے اسے کلہاڑیوں اور خنجروں سے کاٹ ڈالا۔ پھر اس کی لاش دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دی گئی۔ اب وہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ دوسروں کا حشر بھی یہی ہوگا۔ اندر گھس آئے تو ایک ایک کو مار ڈالیں گے۔

نور نے سنا، باہر سے بلند ہونے والی آوازوں میں دہشت نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

مولوی اشفاق مہرا اور خلیل مہرا نے مشورہ کیا۔ انہیں اب بالائی منزل، نچلی منزل سے زیادہ محفوظ لگ رہی تھی۔ لڑکوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولوی اشفاق عورتوں کو لے کر دوسری منزل پر آ گئے۔ ان کی ہدایت پر نور کی دادی اماں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور شرجیل، عثمان، غیاث وغیرہ کرسی اٹھا کر دوسری منزل پر لے گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت دادی اماں کو رونے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو مولوی اشفاق نے انہیں گول مول سا جواب دیا۔

یہ آوازیں دراصل فدا حسین اور اس کی بیوی کی تھیں۔ اپنے بچے کی دردناک موت نے انہیں نوحہ کناں کر رکھا تھا۔

اشفاق صاحب بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ دکھ اور تشویش کی انتہا پر تھے۔ ایک طرف بے گناہ بیٹی اور اس پر ہونے والے ظلم وستم کا تصور تھا، دوسری طرف اپنے پورے خانوادے کی جان اور آبرو تھی۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ بسمہ کو اس کی پھپھو حاجرہ اور چھوٹی امی نے سرخ جوڑا تک پہنا دیا تھا مگر حتمی فیصلے کی ہمت ابھی تک کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

اشفاق صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ لرزتی کانپتی بسمہ ان کی بائیں جانب اور بتول دائیں جانب تھی۔ مہرین اور ماموں زاد سلیمہ ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ اشفاق صاحب نے بسمہ اور بتول کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

''ارے نور کہاں ہے؟'' پھپھو حاجرہ نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ''نور.....نور!'' انہوں نے آوازیں دیں۔

اشفاق صاحب کی بیگم زلفت بھی اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''کہاں گئی وہ؟'' بتول نے بھی بے قراری سے کہا۔

اشفاق صاحب کچھ بڑبڑائے اور اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ بادل پھٹے تھے اور پوری رات کا چاند جھانکنے لگا تھا۔ اشفاق صاحب نور کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے، مہرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کا سنگل اسٹوری پورشن دکھائی دے رہا تھا۔ چھت پر لگا ہوا ٹی وی انٹینا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اچانک ایک منظر نے اشفاق صاحب کو جکڑ لیا۔ ان کی ساری حسیات جیسے سمٹ کر ان کی آنکھوں میں آ گئیں۔ انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر ان کی اپنی ہی نگاہوں کو بھروسا نہیں ہوا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟ وہ مہمان خانے کی چھت سے نیچے پرالی کے ایک ڈھیر پر چھلانگ لگا رہی تھی..... ہاں، یہ وہی تھی..... یہ وہی نافرمان تھی، وہی سرکش تھی.....

مہرین نے بھی بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی فلم ہوتی اور یہ منظر سلوموشن میں دیکھا جاتا تو بے حد سنسنی خیز ہوتا۔ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی پرالی کے ڈھیر پر گری۔ وہاں سے اٹھی..... سنبھلی..... اور بھاگی۔ ہاں..... وہ بھاگی، اس کے سامنے تھور زدہ طویل میدان تھا۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے للکارے بلند کیے اور اس کے پیچھے لپکے..... ابھی کچھ دیر پہلے وہ فدا حسین کے لڑکے رشید کے پیچھے بھاگے تھے اور اسے پکڑ لیا تھا..... لیکن..... یہ رشید نہیں تھا۔ یہ نور تھی۔ یہ پاکستان کی مانی ہوئی اسپرنٹرز میں سے ایک تھی اور وہ بھاگ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس نے دوپٹا کس کر کمر سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوگرز تھے۔ آج اس کا اسکارف پھسل گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

''پکڑو..... جانے نہ پائے۔'' ایک للکار بلند ہوا۔

لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چمکیں۔ تعاقب کرنے والوں کے قدم برق رفتار ہوئے، وہ اسے دبوچنے کے لیے پوری طاقت سے بڑھے مگر ان کے آگے نور تھی..... اور نور کی رفتار..... بہت ہوتی ہے.....

مولوی اشفاق منڈیر کے آخر تک آئے اور سینے کی پوری قوت سے چلائے۔ ''بھاگو عین النور..... بھاگو..... ان کے ہاتھ نہیں آنا عین النور..... بھاگو'' ان کی آواز گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے عین النور کا جواب نہیں سنا..... مگر مولوی اشفاق نے سنا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا..... میں آپ کی بیٹی ہوں ابا جان! آپ کی ناکارہ ترین بیٹی۔ آپ کو بہت دکھ دینے والی، مایوس کرنے والی لیکن آج میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی..... ہاں، میں نہیں کروں گی کیونکہ یہ میرا میدان ہے، یہ میرا راستہ ہے۔

''بھاگو عین النور..... بھاگو'' مولوی اشفاق پھر پوری طاقت سے پکارے اور یہ وہی مولوی اشفاق تھے، جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا..... مت بھاگو عین النور۔

''رن فاسٹ.....نور! رن فاسٹ۔'' مہرین بھی چلائی۔

اور وہ بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ چھریرے بدن کی ایک لڑکی اور...... اس کے عقب میں موت کے ہرکارے، درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم کے قریب۔ تعاقب کرنے والوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، کڑیل جوان بھی اور بالکل نوجوان چودھری زادے بھی۔ انہیں یقین تھا، وہ حصار توڑنے والی اس لڑکی کو بارشی نالے تک نہیں پہنچنے دیں گے کیونکہ بارشی نالے کے پار جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا اور پھر اس سے آگے وہ راستہ تھا جو سیدھا پولیس چوکی تک پہنچتا تھا اور وہ شاید اسی رخ پر جا رہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام ہوئے تو بھاگتے بھاگتے اس کی طرف چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں اور لاٹھیاں وغیرہ پھینکنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ان کی جھلاہٹ دیدنی تھی۔ ایک لڑکی، ایک کمزور لڑکی...... ان کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔

ہاں، قدرت ایسے ہی ہار کو جیت میں بدلا کرتی ہے۔ ایسے ہی جاں گسل مشقتوں کا صلہ دیا کرتی ہے۔ ایک طرح سے نہ سہی دوسری طرح سے...... دوسری طرح سے نہ سہی، تیسری طرح سے۔ بے شک محنتیں رائگاں نہیں جاتیں۔ جاں سوزیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ آخر صلے مل کر رہتے ہیں۔

مولوی اشفاق اپنی بیٹی کی جیت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ منڈیر کے آخری سرے تک پہنچ چکے تھے...... "بھاگ جاؤ نور...... پولیس تک پہنچ جاؤ۔" وہ بار بار کہتے تھے۔ انہوں نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں، ان کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

اب بسمہ، بتول، سلیمہ، چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ اور بہت سے دیگر لوگ اس جگہ جمع ہو چکے تھے اور روشن چاندنی میں، سکتہ زدہ کرنے والی یہ انوکھی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ٹویوٹا گاڑی بھی نور کے پیچھے لپکی۔ یہ پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس پر بسمہ کو لے جایا جانا تھا...... زندہ یا مردہ ...... (چودھری طغرل نے یہی کہا تھا) گاڑی برق رفتاری سے نور کے تعاقب میں پہنچی تو وہ دائیں جانب کے ان تھور زدہ کھیتوں میں گھس گئی جن میں پکی منڈیریں بنا کر، انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بری طرح پھدکنے اور ڈگمگانے لگی۔ نور اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم برق کی طرح حرکت کر رہے تھے...... بال لہرا رہے تھے۔ وہ ایک ایتھلیٹ کی تمام تر مہارت کے ساتھ فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی اور آج اس کی فنش لائن یقیناً وہ بارشی نالا تھا جس کی دوسری جانب جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا۔

ٹویوٹا گاڑی کسی گڑھے میں پھنس کر گھوم گئی اور ڈھیروں مٹی اڑانے لگی۔ دوڑنے والوں میں بہت سے لوگ ہمت ہار کر سست پڑ چکے تھے مگر کھاپری برادری کے چند تیز طرار لڑکے اب بھی بھیڑیوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے...... اس تک پہنچنے کی سعی کر رہے تھے...... انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوڑ کے لیے ایک نہایت غلط حریف چن بیٹھے ہیں۔ بے شک کمزور، بے شک لڑکی...... لیکن بے شمار ایونٹس کی فاتح، پروفیشنل رنر۔ اس نے ایک بار پھر اپنا رخ تھوڑا سا پھیرا اور بھاگتی ہوئی اس بارشی نالے میں اتر گئی جہاں پانی اس کی کمر سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ جس رفتار سے دوڑی تھی، اسی ہمت سے اس نے نالے کو پار کیا اور دوسرے کنارے سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے نالے میں کودنے والے نوجوان کھاپریوں کو ابھی کنارے تک پہنچنے میں کم از کم ایک منٹ درکار تھا۔ یہ ایک منٹ نور کے لیے بہت زیادہ تھا۔

☆☆☆

نور نے نالے کے نیالے سرد پانی میں سے نکل کر کنارے پر چڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، چاندنی میں ان کھاپریوں کے ہیولے صاف نظر آ رہے تھے جنہوں نے اس کے پیچھے برساتی نالے میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ وہ ابھی نصف پاٹ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ انہیں نور تک پہنچنے کے لیے کم و بیش ایک منٹ درکار تھا...... اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔ وہ جب بے دلی کے ساتھ بھی بھاگتی تھی تو بارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ میں سو میٹر طے کر لیتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ اندھا دھند تو نہیں بھاگ رہی تھی مگر پھر بھی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس کے اردگرد اب خودرو جھاڑیاں تھیں اور دس بارہ فٹ بلند سرکنڈے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ شاید آج اسے کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ آج اس کے کانوں میں اس کے ابا جان کی آواز پڑی تھی۔ یقیناً وہ اس کے ابا جان کی آواز ہی تھی۔ جب اس نے چاول کی چھال کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے پاؤں کو پوری رفتار سے حرکت دی تھی، اس نے مہمان خانے کی چھت سے یہ آواز سنی تھی۔ انہوں نے پکار کر اسے

بھاگنے کا اور کھا پریوں کے ہاتھ نہ آنے کا کہا تھا...... وہی تو تھے جو اسے عین النور کے نام سے پکارتے تھے۔ بے شک یہ وہی تھے۔ اس آواز نے نور کے حوصلوں کو پہاڑ کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ آج اسے کوئی نہیں چھو سکے گا اور کوئی نہیں چھو سکا تھا۔

اب بھی وہ پوری ہمت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس کے کپڑے سخت سردی میں نالے کے پانی سے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے مگر شدید جسمانی مشقت کے سبب اس کے زیریں جسم کو بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فقط شانوں اور چہرے کو ہوا کے تھپیڑے لگ رہے تھے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا، کہیں عقب سے بپھرے ہوئے کھاپری اس پر کوئی فائر نہ کر دیں۔ ابھی تک تو خیریت گزری تھی اور اسے لگتا تھا کہ خیریت ہی رہے گی۔ یہ امنالے کے میلے کے دن تھے۔ علاقے کے بدترین افراد بھی نسلوں سے چلے آنے والے رواج کے مطابق فائر ہونے والے ہتھیاروں کو چھونا گناہ سمجھتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سیدھی پولیس چوکی کی طرف جا رہی ہے۔ کل دوپہر اس نے آسمانی جھولے کی بلندی سے جو فضائی منظر دیکھا تھا، وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ پھر بھاگتے بھاگتے ایک دم ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ڈر گئی۔ میلے کے دنوں میں علاقے میں آتشیں ہتھیار ممنوع ہو جاتے تھے۔ کیا پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتے تھے؟ اس بارے میں اسے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا لیکن اگر پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں تھے تو پھر ...... وہ بپھرے ہوئے ہجوم کو اور جنونی کھاپریوں کو کیسے روک سکتے تھے؟

اس نے اپنی شلوار کے پانچوں کو جرابوں میں گھسا کر ٹراؤزر کی شکل دے رکھی تھی۔ جوگرز کے تسمے بھی کس کر باندھ رکھے تھے، پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ چاندنی پھر ایک دم اوجھل ہو گئی تھی اور اسے تیز بھاگنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پروفیشنل اسٹیمنا کی مالک ہونے کے باوجود ہانپ رہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اب چوکی زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید ایک دو منٹ کا فاصلہ تھا...... یہی وقت تھا جب اسے عقب سے ایک فائر سنائی دیا۔

☆☆☆

ذوالقرنین کا دل شام سے ہی کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ رات گہری ہونے کے ساتھ ساتھ گرج چمک اور بارش کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ذوالقرنین کو کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت۔ نور کی مسلسل سرد مہری نے ذوالقرنین کو جیسے اس کی اپنی نظروں سے ہی گرا دیا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ گرے پڑے لڑکوں کی طرح وہ کام کر رہا ہے جسے عرف عام میں ''بھونڈی'' کہا جاتا ہے۔ وہ اصلاح معاشرہ کا ٹھیکیدار بنتا تھا اور اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور تھا کہ کسی موہوم امید کے سہارے نور کے پیچھے یہاں موراں والی تک چلا آیا تھا۔ بے شک میلا دیکھنے کی دعوت اسے پچھلے سال اشفاق مہر صاحب نے بھی دی تھی اور یہ ایک معقول بہانہ تھا مگر جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ تو ذوالقرنین اچھی طرح جانتا تھا۔

اردو بازار کے تین اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ سب ایک مقامی کے گھر کرائے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میلے کے دنوں میں اپنے گھر کرائے پر دینے کا رواج موراں والی میں بھی پایا جاتا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک ذوالقرنین کی طبیعت اتنی بیزار ہو گئی کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی موراں والی سے نکل جائے گا...... (دوستوں کو بتائے بغیر) وہ لوگ علیحدہ گاڑی پر آئے تھے اور جب چاہے جا بھی سکتے تھے۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ خاموشی سے اٹھا۔ وضو کر کے نمازِ حاجات ادا کی۔ سفر کے نفل پڑھے۔ صرف ایک دوست رمیز کو اٹھایا جس سے وہ اپنی کیفیت شیئر کر سکتا تھا۔ اسے اپنی روانگی کا بتا کر اور قائل کر کے وہ چپ چاپ اپنی قیام گاہ سے نکل آیا۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی اور کسی وقت بند بھی ہو جاتی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی اونی کوہاٹی چادر اچھی طرح بالائی جسم پر لپیٹ لی۔ نیلی ایف ایکس گاڑی کھلے میں کھڑی تھی اور برف ہو رہی تھی۔ فوری طور پر تو گاڑی کا ہیٹر بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موراں والی سے اور موراں والی کے میلے سے نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے نکلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر آ جاتا تھا جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیلے والے کے پاس کھڑی تھی اور پھر اسے دیکھ کر بالکل منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کتنی بے اعتنائی، بیگانگی اور بیزاری جھلکتی تھی اس کے انداز سے۔

اس نے گاڑی کو دوسرے گیئر میں ڈالا اور کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پختہ سڑک تک پہنچنے کے لیے اسے قریباً دو کلومیٹر تک اسی نیم پختہ راستے پر جانا تھا اور پھر برساتی نالے کا تنگ پل بھی پار کرنا تھا۔

اس کے دائیں بائیں جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔ چاند نے تھوڑی دیر کے لیے گہرے بادلوں کی اوٹ سے جھلک دکھائی تھی اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک ذوالقرنین بری طرح ٹھٹک گیا۔ اسے بائیں جانب سے کچھ فاصلے پر فائر کی آواز سنائی دی...... ابھی وہ اسی پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب کے سرکنڈوں میں عجیب سی حرکت ہوئی اور کوئی تیزی سے بھاگ کر سامنے سے گزرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ایف ایکس کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آیا تھا۔ ذوالقرنین سکتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ بھیگے لباس اور بھیگے بالوں والی وہ دراز قد لڑکی جو لڑکھڑاتی ہوئی سی بھاگ رہی تھی......نور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی......

حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے گاڑی کے بریک دبائے اور کھڑکی کھول کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ''نور......نور۔''

وہ رک گئی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ''یہ میں ہوں نور۔'' وہ پھر چلایا۔

تب تک شاید وہ بھی ذوالقرنین کی نیلی ایف ایکس پہچان چکی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد گاڑی کی طرف جھپٹی اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ''جلدی کرو...... پولیس چوکی چلو۔ انہوں نے حویلی کو گھیر لیا ہے......وہ......میرے پیچھے بھی آ رہے ہیں۔'' اس کی آواز دہشت کے سبب ناقابلِ شناخت ہو رہی تھی۔

ذوالقرنین بھی حیرت اور سنسنی کے شدید گھیرے میں آ گیا لیکن کوئی سوال پوچھنے کے بجائے اس نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھانا مناسب سمجھا۔ گاڑی غیر ہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی......اور پھر اس نے ایک جگہ سے نالے کا پل پار کر لیا۔

''آپ زخمی تو نہیں ہیں؟'' ذوالقرنین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مضطرب آواز میں بولی۔

ایک آدھ منٹ کے اندر ہی وہ پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ پولیس چوکی کے مختصر صحن میں تاریکی تھی۔ ایک دو کمروں کے روشن دانوں میں لالٹین وغیرہ کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ نور اور ذوالقرنین ایک ساتھ گاڑی سے نکلے اور چوکی کا بیرونی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ بیرونی دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی۔

''دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔'' نور چلانے والے انداز میں بولی۔

اس سے ملتا جلتا فقرہ ذوالقرنین نے بھی دہرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔ پھر ذوالقرنین کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی کی کھلی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ گزار کر ہارن پر رکھ دیا۔

اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ''پتا نہیں بھنگ پی کر سو گئے ہیں سارے۔'' ذوالقرنین جھلا کر بولا۔

نور سخت پریشانی میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور سینے کا زیر و بم واضح تھا۔

اچانک ذوالقرنین کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ اسے چلا کر دیوار کے بالکل قریب لے آیا۔ پھر اس کی چھت پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ نور اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ ''کنڈی چڑھا دیں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور صحن پار کر کے اندرونی کمروں کی طرف لپکا۔

اس نے ایک کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔ اس مرتبہ یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ دروازہ کھلا اور سادہ کپڑوں میں ایک بھاری بھرکم شخص نظر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ چوکی انچارج سب انسپکٹر جان محمد تھا اور خاصا دبنگ شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالقرنین نے جھلا کر کہا۔ ''آپ لوگ کس طرح کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ باہر غدر مچا ہوا ہے اور آپ نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔''

سب انسپکٹر نے اپنی سرخ آنکھوں سے ذوالقرنین کو گھورا، ہو سکتا تھا کہ وہ جواب میں کوئی سخت بات کہتا لیکن اس کی نگاہ خستہ حال نور پر پڑ گئی۔ ''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

نور اپنا سر ڈھانپتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔ ''آپ یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا۔ کھاپریوں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایک بندے کو سخت زخمی اور دوسرے کو قتل کر دیا ہے۔ وہ...... میرے پیچھے ......بھی لگے ہوئے ہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

دو تین اور کمروں کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ کچھ باوردی اور کچھ سادہ لباس والے اہلکار باہر نکل آئے

تھے۔ نور مسلسل بولتی چلی گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر اس نے تقریباً ساری صورت حال پولیس والوں کے گوش گزار کر دی۔ یہ انکشاف ذوالقرنین کے لیے بھی تہلکہ خیز تھا کہ حویلی کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہیں اور نور کی بہن بسمہ کو ایک طرح سے اغوا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نالے کی طرف کوئی فائر کیا گیا ہے بلکہ شاید یہ دو فائر تھے۔ فائر اور وہ بھی میلے کے دنوں میں۔ گڑبڑ تو ضرور ہو رہی ہے جی۔''

دو تین منٹ کے اندر اندر پولیس اہلکار چوکی سے باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ وردی میں اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ دو چار کو چھوڑ کر سب کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سب انسپکٹر جان محمد خود بھی کھاپری برادری سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے فوراً بذریعہ فون قریبی تھانے تک بھی اطلاع پہنچا دی تھی۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے پار حویلی کی جانب روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کہیں تھوڑی بہت آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

سب انسپکٹر جان محمد اپنی نفری کے ساتھ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ کچھ اہلکار موٹر سائیکلوں پر تھے، تین چار ذوالقرنین کی ایف ایکس میں لد گئے۔ تھوڑا آگے جا کر سب انسپکٹر نے گاڑی رکوائی۔ یہاں بہت بڑی ایک جھونپڑا بستی تھی۔ بارش کی وجہ سے ان میں سے کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ سب انسپکٹر نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ پکی رنگتوں والے پانچ چھ افراد لپک کر اس کی طرف آئے۔ اس نے ان سے کچھ کھسر پسر کی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس جھونپڑا بستی میں ہلچل نظر آئی اور درجنوں افراد کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر نکل آئے۔ ان میں سے کچھ گھوڑا ریڑھیوں پر اور کچھ گدھا گاڑیوں پر سوار ہو گئے۔ اس سارے قافلے نے پل پار کیا اور تیزی سے وقوعہ کی طرف بڑھا۔

نور، ذوالقرنین کے ساتھ ایف ایکس میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس نم تھا اور اب وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پولیس اہلکاروں کو حویلی کی تشویشناک صورتِ حال سے بھی آگاہ کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح بچ کر یہاں پہنچ پائی ہے۔

ذوالقرنین نے اسے کانپتے دیکھا تو اپنی گرم کوہاٹی شال اتار کر نور کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ پہلے تو جھجکی اور یوں لگا کہ وہ شال لینے سے انکار کر دے گی مگر پھر خاموش رہی۔ ''اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔'' ذوالقرنین نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پولیس موبائل کی عقبی سرخ بتیاں ذوالقرنین کی راہنمائی کر رہی تھیں۔ ان کے عقب میں خانہ بدوشوں کے ریڑھے اور گدھا ریڑھیاں تھیں۔ غالباً ان کے دو چار کتے بھی شور مچاتے ساتھ آ رہے تھے......

شورزدہ طویل میدان میں پہنچتے ہی حویلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید حویلی کے کسی کونے میں آگ بھی سلگ رہی تھی۔ سب انسپکٹر نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور ایک جگہ گاڑی روک کر آٹومیٹک رائفلوں سے کئی برسٹ چلوائے۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی اور بلوائیوں کے لیے پیغام تھا کہ پولیس آ گئی ہے، وہ ٹکر نہ لیں۔

......کچھ دیر بعد جب وہ لوگ حویلی کے سامنے پہنچے تو گھیراؤ کرنے والے بکھر چکے تھے۔ ذوالقرنین اور نور نے کچھ ٹولیوں کو دریا کی جانب بھاگتے دیکھا۔ کچھ ٹارچوں اور لالٹینوں کی دور ہوتی ہوئی روشنیاں سرکنڈوں کی جانب نظر آ رہی تھیں۔

نور نے دیکھا مشتعل کھاپریوں نے حویلی کے قدیم چوبی دروازے کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش یقیناً نور کے فرار ہونے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ مگر لکڑی اور لوہے سے تیار ہونے والے اس دروازے کا کچھ خاص نہیں بگڑ سکا تھا۔ اب خانہ بدوش بھی پہنچ گئے تھے اور پولیس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ زبردست ہوائی فائرنگ اور پولیس گاڑی کا مسلسل ہوٹر سن کر حویلی والوں کو یقین ہو گیا کہ پانسا پلٹ چکا ہے۔ حویلی کا جہازی سائز دروازہ کھول دیا گیا۔ نور کی نگاہ سب سے پہلے شرجیل، چچا احسان اور اپنے ابا جان پر پڑی وہ لپک کر ان کی طرف گئی۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ٹھٹک گئی، جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر وہ ایسے ہی منتشر سی ہو جایا کرتی تھی لیکن اس بار صورتِ حال مختلف رہی۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے عجیب کیفیت میں اپنے دونوں بازو نور کے لیے کھول دیے۔ وہ لپک کر گئی اور ان کی بانہوں میں سما گئی۔

''میری بچی...... میری عین النور۔'' وہ پکارتے چلے گئے۔ ''آج تم نے وہ کیا جو کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ آج تم میرا بیٹا بنی ہو۔ آج تم نے ہم سب کو ایک بہت بڑی مصیبت اور

خواری سے بچایا ہے......'' انہوں نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا اور اس کا سر اور ماتھا چومتے چلے گئے۔

وہ سسک رہے تھے اور وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ جب روتی تھی تو بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلا کرتے تھے لیکن آج اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

اس کے ابا جان اشک بار آواز میں بولے۔ ''میری بہادر بیٹی...... میری دلیر بیٹی...... شیر بیٹی......''

سب انسپکٹر جان محمد اور اس کے ماتحت تعجب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نور کے ابا جان نے خود کو نور سے علیحدہ کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ میری بیٹی ہے...... یہ...... بہت بڑی رنر ہے...... بڑے میڈل جیت چکی ہے۔ اسی نے آج ان بدبخت کھاپریوں کا گھیرا توڑا ہے اور آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ سوہنے نے اسے ہم سب کی جان آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔''

انہوں نے ایک بار پھر نور کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ نور بولی۔ ''ماموں مراد کہاں ہیں۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔''

''تمہارے تایا اور عثمان وغیرہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو گاڑی آ رہی ہے۔'' انہوں نے ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کیا۔ تاریکی کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس گیٹ تک آ گئیں۔

گاڑی قریب پہنچی تو تایا ابا نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر نور کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف جھکا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اشک بار آنکھوں کے ساتھ لیے جانے والے اس بوسے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ نور نے پچھلی نشست پر دراز ماموں مراد کو دیکھا۔ ان کے سر کی بینڈیج خون سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں، عثمان نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں نور! ٹرنکولائزر کے اثر میں ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ یہی وقت تھا جب ایک چنگھاڑ سی نور کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ گیٹ کے بالکل پاس گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سے ایک پرچھائیں سی جھپٹتی ہوئی نظر آئی۔ تاریکی میں نور کو بس یہی نظر آیا کہ حویلی کے چوکیدار گل محمد کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص پرچھائیں سے لپٹ گیا...... ورنہ یہی لگ رہا تھا کہ وہ پرچھائیں سیدھی نور کی طرف آئے گی۔

ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔ کوئی جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ''مار دوں گا...... کاٹ ڈالوں گا...... ٹوٹے کر دوں گا۔''

نور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور ابا جان نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ نور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹارچوں کی روشنی تصادم والی جگہ پر پہنچی تو نور نے دیکھا کہ چوڑا چکلا ابدال کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جس سے لپٹا ہوا تھا، وہ ذوالقرنین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ابدال کے ہاتھ میں چھوٹے دستے والی چمک دار کلہاڑی تھی اور اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے شعلے تھے۔ صاف طور پر پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے...... اور کسی بھیڑیے سے بڑھ کر خون آشام ہو رہا ہے۔ اس کی کلہاڑی پر ذوالقرنین نے بھی گرفت بنا رکھی تھی اور دونوں تقریباً گتھم گتھا تھے۔ پھر وہ دونوں گر گئے لیکن ذوالقرنین نے کلہاڑی کے دستے پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ اس کی مزاحمت زبردست تھی۔

پھر پولیس والے اور دیگر افراد بھی ابدال پر جھپٹے اور اس خون آشام کو دبوچ لیا گیا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں دہاڑ رہا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ بس ایک فقرہ ہی نور کی سمجھ میں آیا۔ ''اپنی ووہٹی لے کر جاؤں گا، چھوڑوں گا نہیں اسے......''

نور یہ سوچ کر لرز گئی کہ یہی وہ شخص تھا کہ آج رات بسمہ کو جس کے حوالے کیا جانا تھا۔ پولیس والوں نے وہیں گیٹ کے قریب اسے بے دریغ پیٹا اور نیم بے ہوش کر ڈالا۔ لرزتی کانپتی نور کو اس کے ابا جان نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ نور نے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان چاک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں سے خون رس رہا تھا لیکن ویسے وہ بالکل ٹھیک تھا۔

چوکیدار گل محمد کے چہرے پر کلہاڑی کا سخت وار لگا تھا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور ایک طرف کا گال تقریباً کان تک چر کر رہ گیا تھا۔ ایک دوسری گاڑی میں اسے بھی فوراً اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

صورت حال سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پولیس پارٹی کی آمد پر باقی لوگ تو یہاں سے تتر بتر ہو گئے تھے مگر یہ شرابی ابدال کہیں آس پاس چھپ گیا تھا اور کسی موقع کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلنے کے بعد یہ موقع اسے نور پر حملے کی صورت میں ملا جو چوکیدار گل محمد اور ذوالقرنین نے ناکام بنا دیا۔

سب کے سامنے ہی بری طرح مدہوش ابدال کو الٹی ہتھکڑی لگا کر پولیس کی گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ وہ لہولہان

تھا اور ایک ٹوٹا ہوا چمکیلا ہار اب بھی اس کے گلے سے لٹک رہا تھا۔ سب انسپکٹر جان محمد کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے حویلی کے اردگرد سرچ آپریشن شروع کر دیا کہ کوئی اور کھا پری بھی کہیں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ حویلی کا گیٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

ماموں اور چچا وغیرہ اب ذوالقرنین سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ پھر سب انسپکٹر جان محمد نے ماموں اور چچا کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران میں نور نے دیکھا کہ ذوالقرنین آگے آیا۔ نور کے اباجی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''انکل! زخمیوں کو اس طرح اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے، کوئی ساتھ ہو۔ یہ لوگ یہاں سے تو بھاگ گئے ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔''

ذوالقرنین کی بات کا وزن سب نے محسوس کیا۔ افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ذوالقرنین نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے۔ تین مسلح پولیس اہلکار اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی زخمی چوکیدار والی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گئی...... حویلی میں اب حالات مکمل کنٹرول میں تھے۔ معلوم ہوا کہ جب نور چھت سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور کھا پریوں کی زد سے نکل کر سرکنڈوں میں اوجھل ہو گئی تو مایوس ہو کر اور جھنجلا کر کھا پریوں نے حویلی کے گیٹ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیوار کے اوپر سے صحن میں کچھ پیٹرول بم بھی پھینکے۔ جواب میں ان پر چھت سے سخت خشت باری کی گئی...... پیٹرول بموں سے دو تین افراد کو معمولی زخم آئے۔ کسی بڑے نقصان سے بچت ہو گئی۔

......خطرہ ٹل چکا تھا پھر بھی سب انسپکٹر جان محمد نے چند اہلکار گیٹ پر متعین کر دیے اور باقیوں کو ساتھ لے کر لاش کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ نور کے اباجان، چچا جان اور دیگر مرد بھی ساتھ گئے۔ نور، پھپھو ہاجرہ اور تائی راحت کے ساتھ خواتین والے حصے میں آ گئی۔ آپی بتول، بسمہ، مہرین، سلیمہ سب اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک لرزاں تھیں۔ وہ ان سب جیسی تھی لیکن سب جیسی نہیں بھی تھی۔ وہ مختلف تھی اور آج ایک بڑے واقعے نے یہ ثابت بھی کر دیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ستائش تھی اور محبت آمیز نمی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں والی بسمہ نے اسے ایک بار پھر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور سسکنے لگی۔ جب وہ دونوں جدا ہوئیں تو سب اردگرد بیٹھ گئیں اور نور پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ حویلی سے باہر اب پولیس کی مزید گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دینے لگے تھے۔

☆☆☆

......اور یہ منظر تھا لاہور میں مولوی اشفاق مہرا کی رہائش گاہ کا۔ نور اب اپنے گھر میں تھی۔ کچھ لمحے عجیب کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ مشکلیں آسان کر دیتے ہیں۔ بلند و بالا دیواریں جن کے گرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، ریت بن کر مسمار ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب اباجان نے اسے حویلی کے دروازے پر سینے سے لگایا تھا اور اس کا ماتھا چوما تھا اور اسے بہادر بیٹی کہہ کر اس کی پیٹھ تھپکی تھی...... انہی لمحوں میں...... ہاں، انہی لمحوں میں نور نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے اباجان جو بھی کہیں گے وہ سر تسلیم خم کر دے گی۔ اب وہ ساری زندگی ان کی کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ شاید اس کے اباجان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی ایک تھپکی کی قیمت کتنی زیادہ ہے۔ وہ اس ایک تھپکی پر اپنی زندگی نثار کر سکتی تھی۔

اپنے والد کی مرضی و منشا کے لیے جو یہ خداداد آمادگی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ اسے اب ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جلد از جلد اسے استعمال میں لے آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے اٹھ کر وہ ایک دن تایا ابا کے گھر میں جا بسی تھی۔ دل فگار اور پارہ پارہ۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنوری کی شفق رنگ شام لاہور کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ رنگ برنگی پتنگیں فراٹے بھرتی ہوئی فضا میں تیر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ٹھکانوں کی طرف سمٹ رہی تھیں۔ ایسی مختصر اور سرد شامیں اسے اکثر اداس کر دیتی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی وہ گرم کوہاٹی چادر دیکھی جسے اس نے استری کر کے تہ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ خدیجہ سے ملاقات ہو تو وہ اس کے بھائی کی چادر اسے واپس کر دے۔ اس نے بے خیالی میں چادر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں بھر گیا جب اس تہلکہ خیز رات میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھاما تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کندھوں سے اتار کر نور کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ ان لمحوں میں وہی تڑپ، وہی لگن اور لازوال انتظار دکھائی دیا تھا جس کا مشاہدہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی کیا تھا اور جس نے اسے سر تا پا لرزا دیا تھا۔ وہ شروع میں اسے بہت برا شخص سمجھتی تھی پھر وہ اسے صرف برا سمجھنے لگی لیکن اب وہ اس کے لیے ایک اچھا شخص بن چکا تھا۔ سچا، کھرا اور شاید انسانیت سے محبت کرنے والا بھی لیکن

وہ کیا کرتی؟ وہ اچھا ہوتے کے باوجود بلکہ بہت اچھا ہونے کے باوجود اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مجبور سی ہو جاتی تھی۔ کیوں مجبور ہو جاتی تھی؟ شاید...... کوئی آئیڈیل اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ کلین شیوڈ، ماڈرن لباس، چلبلا۔ یا پھر کوئی انجانا خوف تھا جو اس کا راستہ روکتا تھا۔ یہ کیا کیفیت تھی؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی تھی۔

مہرین کبھی کبھی زیادہ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک دو بار اس تہلکہ خیز رات کے حوالے سے اسے چھیڑا بھی تھا۔

ایک دن کہنے لگی تھی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم چوکی کی طرف جا رہی تھیں، خدیجہ کا بھائی اتفاقاً ہی تمہیں آ ملا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''کہیں کوئی رابطہ وغیرہ تو نہیں ہوا تھا پہلے سے؟''

''تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ گلاس مار کر تمہارا سر توڑ دوں۔''

''مگر اس سے مجھے جواب تو نہیں مل جائے گا نا۔ اچھا چلو چھوڑو اس بات کو...... جب تم دونوں اکٹھے گاڑی میں حویلی جا رہے تھے کیسا محسوس ہوا تمہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی بات تو کی ہو گی اس نے یا تسلی کے لیے تمہارا ہاتھ شاتھ تھاما ہو گا......''

''اس وقت تین پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے گاڑی میں...... اور کلینا منہ کو آ رہا تھا۔'' نور نے بیزار لہجے میں کہا تھا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

حویلی والے واقعات کو اب قریباً دس روز ہو چکے تھے۔ دو تین اخبارات میں حویلی والے واقعے کی تفصیلی خبر بھی چھپ چکی تھی...... اس میں جانی پہچانی ایتھلیٹ نور کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا اور بتایا گیا کہ اس نے کس طرح ایک نہایت سنگین صورتِ حال میں اپنی فیملی کی مدد کی اور بھاگ کر ایک قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچی۔ جو بھی نور سے ملتا تھا، پہلے اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا جان گھر میں ہی تھے۔ آپی بتول، آپی کے شوہر غیاث اور بسمہ ماموں مراد کی خبر گیری کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے سر کا باقاعدہ آپریشن ہوا تھا اور اب وہ روبہ صحت تھے۔ چوکیدار گل محمد کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے اور جبڑے کی ہڈی بھی فریکچر ہوئی تھی۔ وہ زیر علاج تھا مہرا فیملی اس کی پوری نگہداشت کر رہی تھی۔

نور، ابا جان کے سر کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ ان کے عقب میں تھی۔ اپنی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ابا جان نور کو حویلی کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے مطابق فدا حسین کے بیٹے رشید کے قتل کا مقدمہ چودھری طغرل اور اس کے بڑے بیٹے ابدال کے خلاف ہی درج ہوا تھا۔ آٹھ دس اور افراد بھی نامزد تھے مگر بڑے مجرم یہی دونوں تھے۔

ابا جان نے کہا۔ ''یہ بھی پتا چلا ہے کہ پرسوں طغرل کو پولیس اسٹیشن میں دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے جہلم کے اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ اس کی حالت ڈانواں ڈول ہے۔ دراصل سب انسپکٹر جان محمد نے دونوں باپ بیٹے پر بڑی ٹائٹ ایف آئی آر کاٹی ہے۔ دو تین اور کیس بھی کھل گئے ہیں ان کے خلاف۔ پھانسی سے بچ بھی گئے تو آٹھ دس سال تو باہر نہیں آئیں گے انشاء اللہ۔''

''ابو! اس فائر کی سمجھ نہیں آئی جو نالے کے پار کیا گیا۔ پتا نہیں کہ مجھے نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر وہ ہوائی فائر تھے؟''

''اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔'' ابا جان نے اپنے ہاتھ میں موجود ننھی سی تسبیح کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہارے نکل جانے کے بعد یہ لوگ ناچ کر رہ گئے تھے۔ مایوسی میں ہی انہوں نے گیٹ پر پٹرول ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی اور اسی مایوسی اور بدحواسی میں ایک کھاپری نے یہ دو فائر بھی کیے۔ یہ فائر نالے کے پار کے ایک ڈیرے سے کیے گئے۔ وہاں ایک چرسی ٹریکٹر ڈرائیور نے بھوسے کے ڈھیر میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہوا میں دو گولیاں چلائیں اور سمجھا کہ شاید تم اس طرح ڈر جاؤ گی مگر تب تک تم چوکی کے سامنے پہنچ چکی تھیں......''

تھوڑی دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ہولے سے بولی۔ ''ابو! ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں، بولو عین النور۔''

''میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ مجھے دل کی گہرائی سے معاف کر دیں...... میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی۔ آئندہ زندگی کے بارے میں آپ میرے متعلق جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہو گا۔''

انہوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے تھے۔ اسے بازو سے پکڑ کر انہوں نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ

رہی تھی وہ اس کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔
"میری بچی!" انہوں نے بڑے جذبے سے کہا اور اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ "تم..... بھی مجھے معاف کر دو۔ میں نے بھی تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ تمہیں دکھ دیا ہے۔"

نور کا سر ان کے سینے پر تھا۔ وہ اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ آنکھوں کے کنارے جل تھل ہی نہیں رہے تھے، بھیگ بھی رہے تھے۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ "دیکھو، قدرت بھی کیا کیا منظر دکھاتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کو ہمیشہ بُرا کہا..... اس وجہ سے ہمیشہ تم سے خفا رہا مگر..... تمہارے اسی شوق کی وجہ سے اس رات ہم سب نے نئی زندگی پائی۔ جو کام کوئی اور نہ کر سکا، وہ تم نے کیا۔ میں ان لمحوں کو کبھی بھول نہیں سکتا نور۔ اگر تم ان کے ہاتھ آ جاتیں تو.....تو....." وہ اس سے آگے کچھ بول نہ سکے اور چند لمحے کے لیے رقت آمیز کیفیت میں رہے۔

تب سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔
"انسان خود کو عقلِ کُل سمجھتا ہے اور قدرت اسے بتاتی ہے کہ اس کی فہم و دانش کی کیا حقیقت ہے..... پتا نہیں کیوں آج مجھے لگتا ہے کہ تم اس رویے کی حقدار نہیں تھیں جو میں نے اب تک تم سے اپنائے رکھا....."

"ابو جی! اب چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ سب ماضی کا حصہ ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بس آپ کی بیٹی ہوں۔" اس نے اپنے گرم آنسو اپنے ابو کے سینے کو سونپ دیے۔ وہ حیران تھی کہ یہ آنسو کئی برسوں تک کیوں اس کی آنکھوں میں آزادانہ راہ نہیں پا سکے..... کیا پہلے..... وہ اپنی شناخت چاہتی تھی، اپنی ذات کو منوانا چاہتی تھی، اس کے بعد ان آنسوؤں کو راستہ ملنا تھا؟

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہ بہار کے آغاز کی ایک سہانی رات تھی۔ سارے میں موتیے اور گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ پرسوں نور کی سگائی تھی۔ ابا جان کی دیرینہ آرزو کے مطابق اس کی منگنی مولانا حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ذوالقرنین سے ہی ہونے والی تھی۔ اپنے عزم کے مطابق اس نے ابا جان اور تایا جان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ تائی راحت نے اپنے دلنشیں انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "نور..... عورت کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے جو اسے چاہتا ہے۔ نہ کہ اس سے جسے وہ چاہتی ہے۔"

اور وہ بھی جانتی تھی کہ ذوالقرنین دل کی گہرائیوں سے نور پر فدا ہے۔ اس کے کئی ثبوت تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ امتاں دالے کے میلے میں بھی موجود تھا اور اس موقع پر بھی موجود تھا جب طوفانی شب میں نور اس ویران پولیس چوکی کے دروازے پر دستکیں دے رہی تھی......اور اس وقت بھی جب چوکیدار گل محمد حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش میں گر چکا تھا......وہ خاموش محبت اپنے سینے میں لیے برسوں سے اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

اور نور بھی یہی سوچ رہی تھی۔ انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے اور ایک دن شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی تھی..... تو پھر کیوں نا اس میں بڑوں کی خوشنودی شامل ہو جاتی۔

اگلے روز نور ایک اور امتحان سے دوچار ہو گئی۔ یہ بھی کڑا امتحان تھا۔ وہ تایا زاد مہرین سے مل کر واپس اپنے گھر آئے تو ملازمہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ شاید آپ کا ہے چھوٹی بی بی۔"

نور نے لفافہ دیکھا اور اس کے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ محکمانی لیٹر تھا۔ اسی مہربان نامہرباں ادارے کی طرف سے جس نے جاب فراہم کی تھی اور جس کی نمائندگی وہ قومی کھیلوں میں کر چکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والے ٹرائلز کی بنیاد پر نہ صرف اس کی ملازمت بحال کر دی گئی تھی بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ دو دوسری ایتھلیٹس کے ساتھ نیشنل اسپورٹس میں محکمے کی نمائندگی بھی کرے گی۔

یہ ایک بڑی خوشخبری تھی لیکن ایک ایسے موقع پر آئی تھی جب اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو زندگی کے ایک مشکل ترین دوراہے پر محسوس کیا۔ خط اس کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی اور اسپورٹس دونوں کام ایک ساتھ کبھی نہیں چل سکتے۔ وہ اپنے ہونے والے سسرالیوں کے خیالات اچھی طرح جانتی تھی اور اپنے ابا جان کے مزاج کو بھی۔ وہ ان دونوں راستوں میں سے بس ایک ہی راستہ چن سکتی تھی۔ ایک جاں گسل کشمکش کے بعد اس نے وہی راستہ چنا جو اسے چننا چاہیے تھا۔ اس نے نہ صرف وہ خط پھاڑ دیا بلکہ گھر کے عقبی کمرے میں پہنچی۔ یہاں وہ سارے ایوارڈز اور ٹرافیاں وغیرہ موجود تھیں جو تایا ابا کے گھر سے واپس اس کے گھر میں آئی تھیں۔ چھوٹی امی زلفت نے یہ ٹرافیاں اس کمرے میں سجا دی تھیں۔ اس نے ان ساری ٹرافیوں اور ایوارڈز کو ایک ڈبل بیڈ شیٹ میں گٹھڑی کی طرح باندھا اور تہ خانے میں

جا کر اس پرانی جستی پیٹی میں پھینک دیا جو شاید اسی کام کے لیے خالی پڑی تھی۔ اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، سینے میں جیسے دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوق سے یوں بچھڑ رہی تھی جیسے کوئی دیرینہ محبوب ساتھی سے بچھڑتا ہے۔

ملازمہ سودا سلف لینے قریبی مارکیٹ جا چکی تھی۔ اس وقت نور گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ایک الماری تک پہنچی۔ وہاں وہ امپورٹڈ ایتھلیٹکس شوز رکھے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تایا ابا نے اسے یو ایس اے سے منگوا کر دیے تھے۔ یہ اس کے سب سے محبوب شوز تھے۔ وہ انہیں لے کر چھت پر چلی گئی۔ ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ دکھا دی۔ وہ جل گئے تو ان کی راکھ ایک شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

اس کے بعد کمرے میں بند ہو کر اس نے دیر تک آنسو بہائے اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ تب جاگی جب شام گہری ہو گئی اور ڈرائنگ روم میں پھر سے ڈھولک بجنا شروع ہو گئی...... اس کی منگنی میں اب بس چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے تھے اور شادی میں بھی زیادہ دن نہیں تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ شاید ان دنوں بھی ایسا ہی تھا۔ دن مختصر تھے اور شادی کی تیاری میں صبح سے شام اور پھر رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ شاپنگ ہو رہی تھی۔ دو تین بار خدیجہ بھی نور کے ساتھ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بھائی کی دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ جیسے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ایک دن وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شادی سے پہلے اپنے ہونے والے میاں سے نہیں ملو گی؟''

''وہ کیوں؟''

''بھئی، تمہاری ہچکچاہٹ اور خوف میں کمی واقع ہو جائے گی۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کے بھائی خوفناک ہیں؟''

''اگر خوفناک نہیں تو پھر تم نے سگائی کے بعد ایک بار بھی میل ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟''

''اب ایک ہی بار مل لیں گے...... اور بھگت بھی لیں گے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے...... بھگت لیں گے۔'' خدیجہ نے اس کے سر پر ہولے سے چپت لگائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نور! تم سے کہا تھا نا کہ وہ سخت ضرور ہے، کئی معاملوں میں دوٹوک رائے رکھتا ہے لیکن یہ سختی ویسی ہی ہے جیسے...... اخروٹ کی ہوتی ہے۔ اندر سے کتنا نرم اور مزیدار ہوتا ہے۔''

نور بولی۔ ''لیکن اخروٹ کی ''نرمی'' تک پہنچنے کے لیے کافی مشکل پیش آیا کرتی ہے جناب...... کچھ کی ''نرمی'' تو اپنے سخت خول سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔''

''وہ ایسا نہیں ہے نور! تم بے فکر رہو۔ بس تھوڑا سا...... ٹائم دینا اسے۔''

اور یہ نور کی شادی کی رات تھی۔ اپریل کی درمیانی تاریخیں تھیں۔ بہار کا شباب تھا...... اور شباب پر بہار تھی۔ پوری راتوں کا چاند دمک رہا تھا۔ بہار اور چاندنی کا ملاپ دلوں میں جادو جگا دیا کرتا ہے۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی میں پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے میک اپ اور بھاری گہنے وغیرہ کبھی پسند نہیں رہے تھے مگر کچھ معاملات وقت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ اسے اپنا یہ روپ بالکل بھلا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے دل و جان سے نبھانا چاہتی تھی اور پھر وہ گھڑیاں آئیں جب اس کا شریک حیات، اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ نور کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سانسوں کی آمدورفت تیز ہو گئی۔ گلاب، گیندے اور نرگس کے پھولوں کی مہک اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی۔ سرخ جوڑے کے اندر اس کا سیمیں بدن تھا اور اس بدن کے اندر اس کا دل تھا اور اس دل میں امید کی کرنیں روشن تھیں۔ کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں ان نیلی سفید کرنوں کو دھڑکانے لگی تھیں۔ کرنیں متحرک تھیں اور جھلملا رہی تھیں۔

اس نے گھونگٹ اٹھایا۔ چند رسمی فقرے ادا کیے اور پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں پر مہندی تھی اور نقرئی پازیبوں کی جھلملاہٹ تھی۔ اس نے نور سے تمام تر توجہ ہٹا کر اس کے پاؤں پر نگاہ جمالی، پھر عجیب انداز سے ان پر ہاتھ پھیرا۔

یکا یک نور کے ذہن میں ایک سیاہ جھکڑ چلا اور اس کے پورے بدن میں پھیل گیا۔

اسے لگا...... اسے لگا اس کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا ہے۔ وہی مناظر اس کے ذہن پر جھپٹے جو ایک مرتبہ غنودگی کے عالم میں اس کے پردۂ تصور پر ابھرے تھے۔ اس نے کہا تھا، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی کہ تمہیں پانے کے بعد کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا مجھے ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ ہماری جدائی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں...... اور پھر......

...خون کی پچکاریاں اور نور کی اپنی ہی آہ و بکا اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنے کے اوپر سے کاٹ ڈالے گئے تھے۔ نہ رہیں گے پاؤں، نہ بھاگے گی تو...... نہ بھاگے گی تو۔

تو کیا آج وہی تصور حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا...... یا اس تصور جیسا کوئی اور بے رحم منظر سامنے آنے والا تھا؟ پھولوں کی لڑیوں کے درمیان سے نور کو ذوالقرنین کی پشت نظر آرہی تھی۔ اس کی کریم کلر شیروانی، اس کی ہموار ڈاڑھی کی ایک سائڈ اور اس کا ایک ہاتھ جس میں ایک چابی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ان کے تاثرات۔ اس نے چابی سے الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکال لیا۔ وہ دیکھ نہیں سکی۔ اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کیا نکالا تھا؟ کیا ایک تیز دھار چاپڑ...... یا اس جیسی کوئی اور چیز؟ نہیں، وہ چاپڑ نہیں تھا۔ وہ ایک ڈبا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی گہرا سرخ خون جو اس کے عروسی لباس کا تھا...... مگر نہیں، وہ سرخ خون نہیں تھا۔ وہ تو سرخ رنگ کا ڈبا تھا جس کے نیچے کی طرف سفید دھاریاں تھیں۔ وہ ڈبا لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے کھولا...... اس میں اسٹھلیٹک شوز تھے۔ امپورٹڈ، سفید رنگ کے یو ایس اے کے بنے ہوئے، اسپرنٹرز کے لیے مخصوص۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ نہیں، یہ حقیقت تھی۔ ذوالقرنین نے شوز نکالے۔ عجیب نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ محبت سے مسکرایا اور بولا۔ ''پاؤں آگے کرو نور۔''

وہ ششدر تھی۔ کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

کون کہتا ہے محبت لوگوں کو نہیں بدلتی؟

محبت لوگوں کو بدلتی ہے۔

ان کی سوچوں کو بدلتی ہے۔

ان کے خیالات کی سب سے گہری پرتوں میں بھی اتر جاتی ہے اور وہاں نئے معیار ایجاد کرتی ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہے۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند روز کے اندر ہی وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئے تھے کہ نور سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ شریک حیات کے لیے جو ایک موہوم سا آئیڈیا نور کے دل و دماغ میں ابھرا کرتا تھا، نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس آئیڈیل کی جگہ حقیقت نے لے لی تھی اور حقیقت خوبصورت تھی۔ اس شخص سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلنواز تھی جو کبھی ایک میگزین کے اسپورٹس انچارج کے طور پر اس کے سامنے آیا تھا...... اب وہ اس کا نام بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔

''ماشاء اللہ۔'' ذوالقرنین نے اس کے عقب میں آ کر کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چونک گئی۔ ڈریسنگ میز کے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کھانے کی ایک دعوت پر جارہے تھے۔ نور نے ہمیشہ کی طرح بہت ہلکا میک اپ کیا تھا۔ چوڑیاں اور جھمکے پہننا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ یہ بھی نہ پہنتی۔ اس معمولی تیاری کے ساتھ بھی وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ ذوالقرنین نے کندھوں سے تھام کر اسے اور اس کے سنگھار کو سونگھا پھر ایک فرحت بخش سانس لے کر بولا۔ ''اللہ آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ میں اپنی قسمت پر ناز کر سکتا ہوں۔''

''کیا اب مجھے شکریہ ادا کرنا ہوگا؟'' وہ مسکرائی۔

''نہیں۔ صرف، میری شیروانی کا اوپر والا بٹن بند کرنا ہوگا۔'' وہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

نور نے اس کی خوبصورت تراش کی براؤن شیروانی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ جچ رہا تھا۔ نور نے شیروانی کا بالائی بٹن ذرا زور لگا کر بند کیا۔ کالر تھوڑا سا ٹائٹ تھا۔ وہ مصنوعی انداز میں کراہنے لگا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اتنے تنگ گلے والی شیروانی میرے سسرالیوں نے سازش کے تحت سلوائی ہے...... جب مجھ سے پیچھا چھڑانے کو دل چاہے گا، آپ مجھے یہ شیروانی پہننے کے لیے دے دیں گی۔''

''آپ زیادہ ڈراما نہ کریں۔ ہاں، یہ ہے کہ دو ماہ پہلے کے حساب سے تھوڑا سا وزن بڑھ گیا ہے آپ کا۔''

''آپ اتنا اچھا پکاتی ہیں تو پھر یہی کچھ ہوگا۔'' اس نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''چلیں، اب دیر ہو رہی ہے۔ خدیجہ اور خالہ نیچے انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور آئینے کے سامنے دوبارہ لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

وہ بولا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ صبح آپ نے ایف اے ایس بھی جانا ہے، کتنے بجے اٹھنا ہوگا؟''

''چھ بجے سے پہلے۔'' وہ مسکرائی۔ ''کل رننگ سیشن بھی ہونا ہے۔''

''یا خدا...... یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟'' ذوالقرنین نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کتنا Cool لگ رہا تھا۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بار بار

تایا ابا کی بات یاد آتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا۔
"صورتیں دھوکا دیتی ہیں نور۔ جب تک کسی بندے کے ساتھ رہا نہ جائے اسے پرکھا نہ جائے، کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔"
بے شک وہ درست کہا کرتے تھے۔

"چھ بجے تو اندھیرا ہوتا ہے زوجہ محترمہ۔" وہ بولا۔

"امید ہے کہ جلد ہی آپ کی شکایات دور ہو جائیں گی۔ جب میں گیم چھوڑ دوں گی، پھر ٹائمنگ کی یہ سختیاں نہیں رہیں گی۔"

"لیکن گیم سے آپ نے مکمل ناتا تو نہیں توڑنا نا۔ جب آپ کوچنگ وغیرہ کی طرف آئیں گی تب بھی وقت تو دینا ہی پڑے گا۔ صبح چھ بجے نہ سہی، سات بجے سہی۔ سات بجے نہ سہی، آٹھ بجے سہی...... نو بجے سہی۔"

"نو بجے سے جناب کو کیا پریشانی ہوگی؟" وہ بولی۔

"پریشانی تو مجھے دس اور گیارہ بجے سے بھی ہو سکتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ، آہستہ آہستہ کچھ کرم فرما دے۔ دل کی بے قراریوں کو ذرا قرار آ جائے۔" وہ کسی چنچل لڑکے کی طرح بولا۔

ذوالقرنین کے مزاج کا یہ رخ نور کے لیے بڑا دل آویز تھا۔ وہ سوچنے لگی کئی کم ہمتیاں کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کچھ عرصہ پہلے پی سی او کے بوتھ سے ذوالقرنین کو ایک سخت فون کرتے کرتے وہ رک نہ جاتی اور ارادہ بدل نہ دیتی تو نجانے ان کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہو جاتی۔ قدرت کے کام قدرت ہی جانتی ہے۔ نور اور ذوالقرنین کے درمیان اس کال والا معاملہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ ایک دن رومانی موڈ میں ذوالقرنین نے اس سے پوچھا تھا کہ میلے پر جانے سے پہلے ایک دن سہ پہر کو نور نے اسے کال کی تھی؟ نور مان گئی تھی مگر یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کال اس نے اچھے نہیں برے موڈ میں کی تھی۔ بس اتنا کہا کہ آپ کو سمجھانا بجھانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد ذوالقرنین نے بھی اسے بتا دیا تھا کہ میلے کے دوران میں اس کے سر پر پٹی کیوں نظر آئی تھی۔ فون بیل سن کر سیڑھیوں سے اس کا لڑھک جانا ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ نور اور ذوالقرنین دونوں ہنستے ہوئے سرخ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

......اور پھر آخر وہ دن آن پہنچا جس کا انتظار مدت سے تھا۔ آج نور ایک بار پھر سو میٹر دوڑ کے میدان میں تھی۔ یہ میگا ایونٹ تھا۔ قومی کھیل تھے اور اس کے سامنے وہی ٹریک تھا جس پر وہ کئی بار ہاری تھی اور ایک بار بری طرح گری بھی تھی لیکن آج وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم وکٹری اسٹینڈ کو تو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی اور اس ترنگ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پرانی حریف نشو بجلی بھی پوری تیاری کے ساتھ ایونٹ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر یہ تھی کہ اس نے کسی فٹنس پرابلم کا شکار ہو کر اپنا قریباً ایک چوتھائی سیکنڈ کھو دیا ہے۔

بظاہر سنجیدہ لیکن اندر سے متبسم ذوالقرنین حوصلہ افزا انداز میں نور کے اردگرد موجود تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی نور کے لیے بے حد اہم تھی۔ نور کی پرفارمنس اب تک بہت بہتر تھی۔ اس نے جاں گسل کوشش کے ساتھ اپنی پرانی فارم تقریباً تقریباً حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی ہیٹس میں ایک مرتبہ اس کی ٹائمنگ 12.05 بھی رہی تھی۔

اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمرے حرکت کر رہے تھے۔ اس کی محترم کوچز نبیلہ وجدان اور میڈم فرحانہ بھی موجود تھیں۔ اپنے مختلف لباس اور اسکارف کی وجہ سے نور ہمیشہ علیحدہ سے نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اس حلیے کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور کچھ ہوٹنگ بھی کرتے تھے۔ نشو بجلی اس کے پاس سے گزری اور حسب معمول ایک فقرہ اچھال گئی۔ "سونے پر سہاگا ہے یار! ایک تو چینڈو، اوپر سے شادی شدہ۔"

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا نظریہ ہمیشہ سے یہی تھا کہ اصل جواب میدان میں ہوتا ہے۔

فائنل ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اس کے پیارے تایا ابا اس کے پاس آئے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنے ساتھ لگایا اور بولے۔ "بیٹا! ہار جیت کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ کوئی ہارتا ہے تو ہی کوئی جیتتا ہے نا۔ اصل چیز تو مستقل مزاجی ہے اور اپنی کوشش سے جڑے رہنا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ غیر مستقل مزاج فاتح سے ایک ایسا ہارنے والا کہیں بہتر ہے جو مستقل مزاجی سے کوشش جاری رکھتا ہے اور نتیجے کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے...... تم جیت سکتی ہو اور ہار بھی سکتی ہو۔ دونوں صورتوں میں تم ہماری جان ہو...... کیونکہ تم...... موراں والی میں وہ جیت اپنے نام کر چکی ہو جو کبھی ہار میں نہیں بدل سکتی......"

نور کو تایا ابا کا جملہ بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک سایہ سا اس کے چہرے پر لہرایا۔ وہ بولی۔ "ابا جان نہیں آئے نا؟"

"نہیں...... لیکن انہوں نے تمہاری کامیابی کی دعا کی ہے۔ ان کی ساری گڈ وشز تمہارے ساتھ ہیں۔"

''پر انہوں نے وعدہ کیا تھا۔''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے...... مگر نور! وہ تم سے خوش ہے۔ تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔''

اناؤنسمنٹ ہو گئی کہ فائنل ریس میں حصہ لینے والی اسپرنٹرز ٹریک پر آ جائیں۔

دیگر لڑکیوں کی طرح نور بھی پہنچ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ابو جان یہاں آئیں۔ انہوں نے اسے نیک دعاؤں سے رخصت کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے جلدی واپس آ گئے تو اسٹیڈیم پہنچیں گے۔

نور نے ان کی دی ہوئی دعاؤں کو یاد کیا اور ان کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دعا اور بددعا میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ابو جان کی دعائیں اس کے ساتھ نہیں تھیں...... نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول پھپھو حاجرہ ایک بددعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرنٹرز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہو سکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آرگومنٹ کر رہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

''کیا ہوا تایا ابا؟'' وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تماشائیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وی آئی پی کی تیسری یا چوتھی رو میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آ گئے تھے...... وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے...... نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے ناخنوں سے اٹھی اور سر کے بالوں تک چلی گئی۔

لاہور کی اس چمکیلی سہ پہر میں آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تھے۔ پوزیشن لینے کا اعلان ہوا۔ اسپرنٹرز نے اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے، آگے کو جھکیں، اسٹارٹنگ لائن کو چھوا۔ سیکنڈ پوزیشن لی اور ان کی سماعتیں فائر کی آواز سننے کے لیے تیار ہو گئیں۔ یہ سب کچھ وہی تھا۔ وہی پوزیشن، وہی ٹریک، وہی تماشائی، وہی دور سے نظر آتی ہوئی فنش لائن کی جھلک لیکن آج ایک چیز نور کے لیے مختلف تھی۔ آج ایک شخص یہاں موجود تھا...... اور آج ایک تھپکی یہاں موجود تھی۔ اور یہ اس محترم شخص کی تھپکی تھی جس نے اسے جنم دیا تھا۔ جس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی تھی۔ جس کو وہ کچھ بن کر دکھانا چاہتی تھی، جس کی نگاہوں میں وہ اپنی ستائش دیکھنے کے لیے ہمیشہ ترسی تھی۔ کبھی بچپن میں بے تکی شرارتیں کی تھیں، کبھی بندر کی طرح اچھلی کودی تھی۔ کبھی نیک پروین بن گئی تھی، کبھی جھگڑے کیے تھے اور بے ڈھنگے لباس پہنے تھے، کبھی کوئی انوکھا ہنر سیکھنا شروع کر دیا تھا...... ابو! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، ابو میری طرف بھی دیکھیں...... ابو، میں تیری ہوں لیکن آپ کی ہوں...... اس نے زندگی کے مختلف مرحلوں میں جو کچھ بھی کیا تھا، ان کی نگاہوں میں آنے کے لیے ہی تو کیا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ ان سے دور سے دور ہوتی چلی گئی تھی اور پھر میلے والا واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی برسوں پرانی آرزوئیں پوری کر دی تھیں۔ اس دن ابو نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ آج اسے ایک اور موقع ملا تھا اپنے ابو کی نگاہوں میں اپنا مقام مستحکم کرنے کا۔ اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آج کچھ کر گزرے گی......

آج سب کچھ وہی تھا جو پہلے ایونٹس میں ہوا کرتا تھا لیکن آج ایک شخص یہاں موجود تھا اور آج ایک تھپکی اسے مل رہی تھی۔

پھر وہ بھاگی...... اس کا دل کہہ رہا تھا، کوئی انہونی نہ ہو جائے ورنہ آج اسے کوئی ہرا نہیں سکے گا۔ اس نے اپنی سخت ترین حریف نشو بجلی کو دیکھا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے تھی۔ بڑی تیزی سے پاس آ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ نصف فاصلے کے بعد اپنا مومنٹم بڑھاتی تھی اور مارجن Cover کر لیتی تھی۔ آج وہ پھر وہی کر رہی تھی۔ اسپرنٹرز کے لیے بھاگنے کے دوران میں بولنا آسان نہیں ہوتا لیکن نور نے نشو کو کن انکھیوں سے دیکھا اور گرجی...... میں پینڈو ہوں...... شادی شدہ بھی ہوں لیکن آج ہراؤ مجھے...... ماں کا دودھ پیا ہے تو ہراؤ مجھے۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی...... اور پھر فنش لائن کا فیتا نور کے سینے سے ٹکرایا تھا......

یہ وہی ساعتیں تھیں جن میں صدیوں پرانے سپنے پورے ہوتے ہیں، یہ وہی لمحے تھے جن میں شکستوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مستقل مزاجوں کے قدم چومتی ہے اور یہ وہی وقت تھا جب سر بے ساختہ سجدۂ شکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔

نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پُرجوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت ترسی تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مسکرانے لگا۔

ختم شد